ایک سوانحی منظر نامہ

گلزار

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک۔ ۱، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

بہ اشتراک

روپا اینڈ کمپنی

مرزا غالب
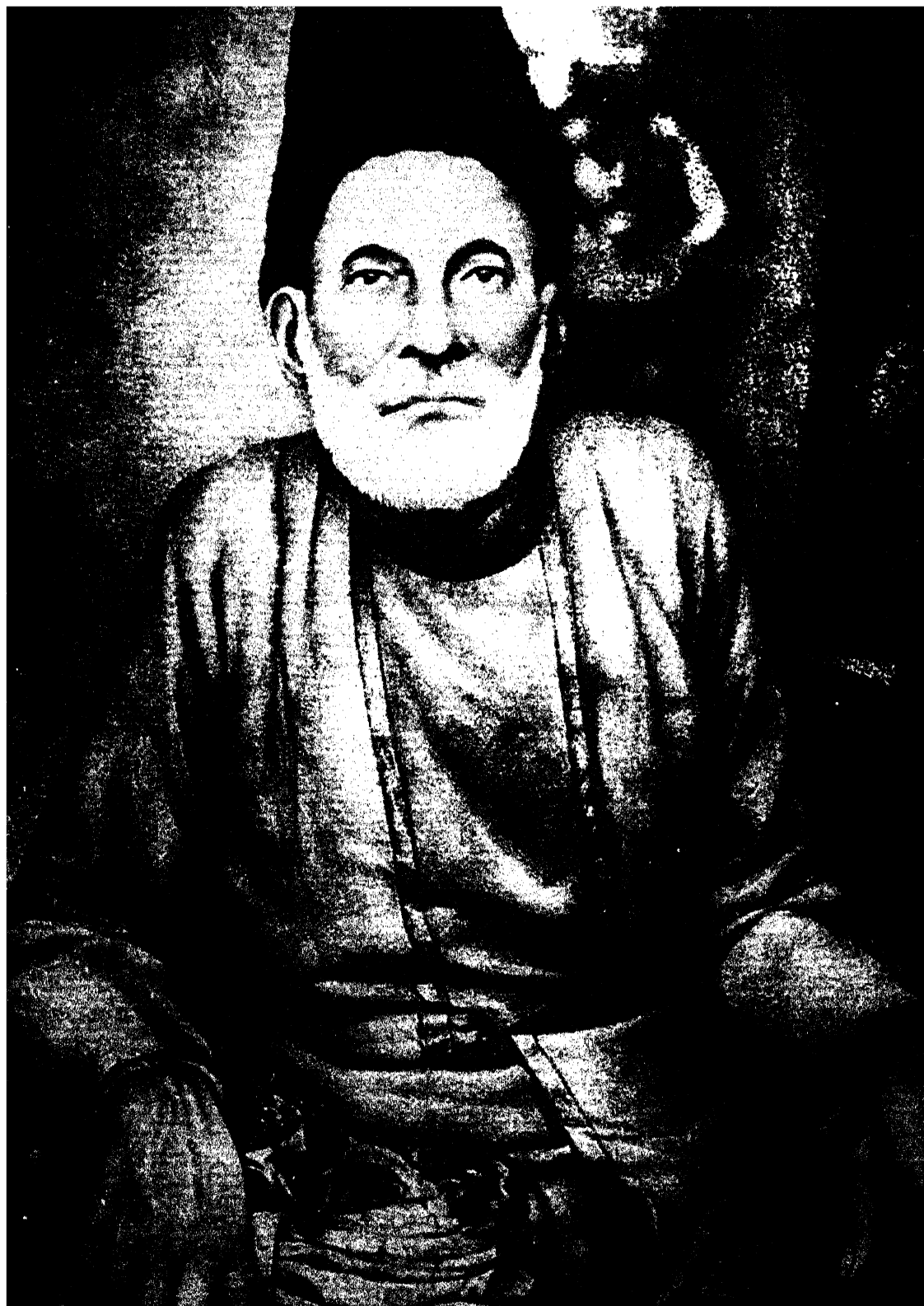
ایک سوانحی منظر نامہ

گلزار

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک۔ ۱، آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی۔ 110066

بہ اشتراک

روپا اینڈ کمپنی

Mirza Ghalib

سنہ اشاعت : 2005

تعداد : 1000

سلسلۂ مطبوعات : 1188

ڈیزائن و کتابت : احد انٹر پرائزز، 2609، بارہ دری، بلیماران، دہلی۔110006

کمپیوٹر کمپوزنگ : فرحانہ محمود

قیمت : 395.00 روپے

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔I، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

بہ اشتراک : روپا اینڈ کمپنی، 7/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی۔110002

طابع : احد انٹر پرائزز

اِنْتِسَابْ

محترم اے۔ ایس تاتاری

وُ

پنڈت ارُون کول

فہرست

صراحت

- سنجوئے شیکھر جس نے بڑی محنت سے کتاب کا پہلا انگریزی ترجمہ کیا۔
- سجنا رائے شوبُل جس نے بڑے شوق سے اس کتاب کی زیبائش کی۔
- شری آر۔ کے مہرہ، جنہوں نے اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں یہ کتاب چھاپ کر، میری آرزو کی تکمیل کی۔

پیش لفظ

غالب جتنے مقبول ہیں اتنے ہی مشکل بھی ہیں۔ ان میں ہاتھ ڈالنے سے بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہوتا ہے۔ ہرچند کہ غالب کی پیدائش کو دو سو برس سے بھی زائد ہو رہے ہیں لیکن غالب کی عوامی مقبولیت حال ہی کی بات ہے۔ حالی اور بجنوری غالب شناسی کے ستون سہی لیکن ابھی ستر اسی برس پہلے تک غالب کی شہرت فقط خواص تک تھی۔ غالب کی مقبولیت کو عوام تک پہنچانے میں فنونِ لطیفہ کا جو کمال ہے ابھی اس پر پوری طرح غور نہیں کیا گیا۔ کے۔ایل سہگل کو سہگل کلکتہ کے نیو تھیٹرز نے بنایا۔ اس زمانے کے His Master's Voice کے ریکارڈوں پر ایک کتا بیٹھا باجہ بجاتا تھا۔ سہگل اور بیگم اختر جو اس وقت 'اختری بائی فیض آبادی' کے نام سے گاتی تھیں، انھوں نے غالب کی غزلوں کے فیض کو عام کیا۔ لیکن غالب ہنوز ذوق اور داغ کے ساتھ ساتھ گائے جاتے تھے۔ اس صورت حال کو بدلا اور سطح کو بلند کیا سہراب مودی نے جن کی فلم نے غالب کی شہرت کو صحیح معنوں میں ہندوستان کے کونے کونے تک پھیلا دیا اور غالب کو ایسا ہردلعزیز بنا دیا کہ باید و شاید۔

پھر ایک عرصے کے بعد کیسٹ، ویڈیو اور سیٹلائٹ ٹیلی ویژن کا سیلاب آیا اور عوامی کلچر کے زمین و آسمان زیر و زبر ہو گئے۔ گلزار نے اپنی تخلیقیت کو اس Critical Moment میں داؤں پر لگایا اور ایسی آرزومندی اور دلسوزی سے لگایا کہ غالب کی آواز برصغیر کے طول و عرض میں گھر گھر پہنچ گئی اور غالب کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ آج اگر غالب کی عظمت ہندستانی عوامی حافظے کا حصہ ہے اور غالب کی مقبولیت ہندوستان کی دوسری زبانوں کے آر پار جاری و ساری ہے تو اس میں گلزار کی 'فنکاری' کا کیا رول ہو سکتا ہے اس کا تصور بھی آسان نہیں۔

غالب کی حیات و شخصیت پر گلزار کے شاہکار سیریل کا یہ منظرنامہ ایک تاریخی دستاویز ہے جس سے غالب کی حد درجہ دلچسپ، پیچیدہ اور پہلودار شخصیت کی کئی پرتیں ایک کے بعد کھلتی ہیں، ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خود گلزار

کے دل و دماغ اور ان کی تخلیقیت نے غالب سے کیا معاملہ کیا، ان کو کس طرح قبول کیا یا دیکھا پرکھا سمجھا یا پھر کس طرح 'بنا' سجا سنوار کے چھوٹے اسکرین کے ناظرین کے لیے پیش کیا، اور ایسا پیش کیا کہ غالب کی بے لوث و بے ریا شخصیت کا 'کرشمہ' چلتا ہوا جادو بن گیا، اور غالب کی آواز تمام ہندستانی پاکستانی عوام خواہ ان کی مادری زبان کچھ ہو، سب کے دل کی دھڑکنوں میں شامل ہوگئی۔ گویا ایک انتہائی پیچیدہ اور غیر معمولی زندگی کو deconstruct اور reconstruct کر کے چھوٹے اسکرین پر از سرنو اس طرح سے 'خلق' کرنا کہ عکس عکس نہ رہ کر زندگی کا سونا بن جائے، اور روزمرہ کا روٹین اور Mundane فنا ہوکر غیر معمولی جمالیات میں ڈھل جائے، یہ آرٹ کا معجزہ نہیں تو کیا ہے؟ غالب کے لاکھوں کروڑوں شائقین کے ساتھ گلزار کے سیریل نے یہی 'حادثہ' کیا۔ اس میں منظرنامہ کے علاوہ موسیقی اور اداکاری کا بھی کمال رہا ہوگا لیکن اگر یہ سب آرٹ کی unity میں ڈھل گئے ہیں تو سوچنے کی بات ہے کہ یہ کمال کس کا کمال ہے اور یہ کارنامہ کس کا کارنامہ ہے؟

سو باتوں کی بات کہ غالب کی بے پناہ اپنائیت اور Down to Earth رویے سے گلزار کے تخلیقی ذہن نے سہج ایک جذباتی اور روحانی رشتہ استوار کرلیا۔ گلزار بے سبب نہیں کہتے کہ بچپن میں ان کے مولوی صاحب غالب کو 'چچا غالب' کہہ کر پڑھایا کرتے تھے۔ بے شک بڑی شخصیتوں سے سب ڈرتے بدکتے ہیں، لیکن گلزار نے جس غالب سے آشنائی کی اسے 'بزرگ کم دوست زیادہ' جانا۔ اس کے لیے جس ذہنی wave-length کی ضرورت تھی وہ گلزار کی تخلیقیت نے فراہم کیا۔ گلزار کی اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ غالب نے بھلے ہی قرض میں زندگی گزار دی، لیکن اب بشمول گلزار ہم سب غالب کے قرضدار ہیں۔ بے شک یہ پوچھنے کا حق گلزار ہی کو پہنچتا ہے کہ انھوں نے غالب کی زندگی 'بنائی' یا غالب نے ان کی زندگی بنادی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ غالب کی شاعری نے آنے والے زمانوں کی، ہم سب کی زندگی بنادی، اور ہماری تہذیبی میراث کو فکری و جمالیاتی رفعت کی ایسی بلندی عطا کردی جس کا بہت سی زبانوں کے سیکولر ادب میں دور دور تک کوئی جواب نہیں۔

ان سب باتوں پر شاہد ہے گلزار کا یہ دستاویزی منظرنامہ۔ یقین ہے اس سے ایک ضرورت پوری ہوگی اور اسے قدر کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

گوپی چند نارنگ

صدر ساہتیہ اکادمی

مُقَدمہ

اور پھر بیاں اپنا......

''غالبیات'' اپنے آپ میں ایک پورا سولر سسٹم ہے جہاں غالب، آفتاب ہے اور ناقدین اس کے سیارے، پلینٹ! کچھ اہم کچھ غیر اہم۔ اُن میں زمین کا سا دھڑ کتا ایک سیارہ ہے گوپی چند نارنگ! اس وقت ہندوستان میں اُن سے بڑی کوئی ''اتھارٹی'' غالب اور اردو پر نظر نہیں آتی۔ غالب کی شخصیت پر لکھا یہ منظر نامہ میں انھیں پیش کر رہا ہوں۔ اصلاح، مشورہ اور تنقید کی غرض سے۔ میں ممنون ہوں کہ پیش لفظ کے لیے ڈاکٹر صاحب نے میری عرض منظور کرلی۔

ایک عرض اور ...... غالب پر کسی تحقیق کا دعویٰ نہیں مجھے، ہاں غالب کے ساتھ ایک لگاؤ کا دعویٰ ضرور کرتا ہوں۔

اسکول میں مولوی مجیب الرحمٰن سے اُردو پڑھی۔ اور انھیں کی بدولت غالب، ذوق، ظفر، مومن، ناسخ اور دوسرے شعرا سے تعارف ہوا۔ بڑے بڑے شاعر اور بڑی بڑی شخصیتیں، اُن کی سوانح عمریاں بھی پڑھیں۔ لیکن غالب کی سوانح عمری پڑھتے ہوئے، ایک عجیب وغریب اپنائیت کا احساس ہوتا تھا شاید اسی لیے ہمارے مولوی صاحب بھی انھیں چچا غالب کہہ کے خطاب کرتے تھے۔ ایسا کوئی خطاب کسی اور شاعر کے نام کے ساتھ کبھی نہیں لگایا گیا۔

ایسا ہوتا ہے، کچھ بڑی بڑی شخصیتوں سے آپ رعب کھا جاتے ہیں، کچھ سے ڈرتے ہیں اور کچھ بزرگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بزرگ کم اور دوست زیادہ لگتے ہیں۔ مولوی صاحب جب جب غالب پڑھاتے تھے تو غالب پڑھتے ہوئے اسی طرح کا احساس ہوتا تھا۔

اردو بس اسکول تک ہی پڑھی، اس کے بعد ہر جگہ ہندی کا زور آ گیا۔ پھر سے قاعدہ لے کر بیٹھنے کی نہ عمر تھی، نہ نیت ہوئی۔ اردو ہی پر قناعت کی اور اسی رسم الخط میں لکھتے پڑھتے رہے۔ مولوی صاحب پاکستان چلے گئے، اردو گھٹی میں پڑی تھی، وجود کا حصہ بن گئی۔ ظاہر ہے غالب کے بارے میں میری دلچسپی بڑھتی ہی رہی۔

میں اکثر کہا کرتا ہوں، غالب کے ہاں تین ملازم تھے جو ہمیشہ اُن کے ساتھ رہے۔ ایک کلّو تھے جو آخر دم تک اُن کے ساتھ رہا، دوسری وفادار تھیں، جو تتلاتی تھیں، اور تیسرا میں تھا۔ وہ دونوں تو اپنی عمر کے ساتھ رہائی پا گئے، میں ابھی تک ملازم ہوں۔

غالب کی شخصیت میں ایک 'ڈاؤن ٹو ارتھ' مزاج ملتا ہے۔ ایک عام انسان کا، جو بڑی آسانی سے غالب کے ساتھ identify کرا دیتا ہے۔ کم سے کم مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ غالب کا حد سے زیادہ آموں کا

شوق، اور پھر زیادہ آم کھانے سے پھوڑوں کا نکلنا، اور پھر پھوڑوں پر مرہم (ملم) کا استعمال، اور 'ملم' لگانے کی تفصیل، وہ بقلم خود بیان کرتے ہیں، لگتا ہے یہ شخص آپ کا پڑوسی ہے۔ مجھے لگتا ہے میں غالب کے ساتھ ان کے گھر پہ رہتا ہوں۔

غالب کا اُدھار لینا، اُدھار نہ چکا سکنے کے لیے پُرمزاح بہانے تراشنا، پھر اپنی خفت کا اظہار کرنا، جذباتی طور پر (emotionally) مجھے غالب کے قریب لے جاتا ہے۔ کاش میری حیثیت ہوتی اور میں غالب کے سارے قرض چکا دیتا۔ اب حال یہ ہے کہ میں اور میری نسل اُس کی قرضدار ہے۔

دوستوں کا ذکر، شکوے، ہنسی مزاح، گھر میں بیٹھ کر لیئی سے لفافے چپکانا اور خط بھیجنا۔ لگتا نہیں کہ اپنے زمانے کے سب سے عظیم شاعر اور دانشور کی بات کررہے ہیں۔

پتہ نہیں کوئی مجھ سے متفق ہوگا یا نہیں، لیکن جس شخص کے ہاں سات اولادیں ہوئیں اور کوئی زندہ نہ رہی، اُس شخص میں کیا جان ہوگی کہ اُس غم کے باوجود، اس کی 'سنس آف ہیومر' اپنے دور کے تمام دانشوروں سے الگ صاف سنائی دیتی ہے۔ اور اس شخص نے دوسری شادی کرنے کا نہیں سوچا۔ مجھے لگتا ہے کہ تمام نوک جھونک کے باوجود غالب نے اپنی بیگم سے محبت کی اور ان کی عزت کی۔ اور ان کے ساتھ پورا پورا اولادوں کا غم بانٹا۔

چچا غالب شعر کہتے ہیں تو لگتا ہے، محسوس کیے ہیں۔ صرف سوچ کر نہیں کہہ دیے۔ زندگی کے ہر موقع کے لیے quotation مہیا کر دیے ہیں۔

وہ جوا بھی کھیلتے تھے۔ کھیل کی طرح کھیلتے تھے۔ شراب بھی پیتے تھے، اس پر پردے نہیں ڈالے، اُسے شرمندگی کا باعث نہیں بنایا۔ غالب کی شخصیت میں مجھے کوئی بات اوڑھی ہوئی یعنی put on نہیں لگتی۔ شاید اسی لیے غالب کی شخصیت اتنا متاثر کرتی ہے۔ اور دس گیارہ برسوں میں جو بھی مواد جمع ہوا میرے پاس اس سے میں نے، غالب کی زندگی پر ایک سیریل بنایا۔

اب آپ ہی بتایئے، میں نے غالب کی 'زندگی بنائی' یا غالب نے میری زندگی بنا دی۔

ایک

1

گلی قاسم جان

صبح کا جھٹپٹا، چاروں طرف اندھیرا لیکن اُفق پر تھوڑی سی لالی۔ یہ قصہ دلّی کا۔ سن 1867 عیسوی دلّی کی تاریخی عمارتیں۔ پُرانے کھنڈرات۔ سردیوں کی دُھند۔ کہرہ۔ خاندان تیموریہ کی نشانی لال قلعہ۔ ھمایوں کا مقبرہ۔ جامع مسجد۔

ایک نیم تاریک کوچہ، گلی قاسم جان۔ ایک محراب کا ٹوٹا سا کونہ۔

دروازوں پہ لٹکے ٹاٹ کے بوسیدہ پردے۔ ڈیوڑھی پہ بندھی ایک بکری۔ دُھند لکے سے جھانکتے ایک مسجد کے نقوش۔ پان والے کی بند دُوکان کے پاس دیواروں پر پان کی پیک کے چھینٹے۔ یہی وہ گلی تھی جہاں غالب کی رہائش تھی۔ اِنہی تصویروں پر ایک آواز اُبھرتی ہے۔

بلّی ماراں کی وہ پیچیدہ دلیلوں کی سی گلیاں
سامنے ٹال کے نکڑ پہ بٹیروں کے قصیدے
گڑگڑاتی ہوئی پان کی پیکوں میں وہ داد ۔ وہ ، واہ ۔ وّا
چند دروازوں پہ لٹکے ہوے بوسیدہ سے کچھ ٹاٹ کے پردے
ایک بکری کے ممیانے کی آواز!
اور دُھندلائی ہوئی شام کے بے نُور اندھیرے
ایسے دِیواروں سے مُہنہ جوڑ کے چلتے ہیں یہاں
چُوڑی والان کے کٹرے کی بڑی بی جیسے
اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں سے دروازے ٹٹولے
اِسی بے نُور اندھیری سی گلی قاسم سے
ایک ترتیب چراغوں کی شُروع ہوتی ہے
ایک قُرآنِ سخن کا صفحہ کھلتا ہے
اسد اللہ خان غالب کا پتہ ملتا ہے۔

دروازے پہ لٹکا ٹاٹ کا پردہ ہلا۔ بوڑھے سے دو پیر نمودار ہوئے۔ موجڑی پرانی تھی ایڑھی کے پاس دبی ہوئی۔ اُنہیں گھسٹتے ہوئے۔ موٹی سی مضبوط سی لاٹھی کے سہارے غالب مسجد کی طرف بڑھے۔ فجر کے سُر ابھی تک فضا میں گونج رہے تھے۔ یہ ایمان والوں کے لئے بُلاوا تھا۔

غالب نے گلی پار کی۔ مسجد کے پاس پہنچ کر ایک آہ بھری۔ سیڑھیوں کے پاس جوتیاں اُتاریں۔ پہلی سیڑھی چڑھے اور رُک گئے۔ آذان اب پوری ہو چکی تھی۔

ایک خاموشی!

چہرہ اُوپر اُٹھا کر دیکھا سامنے مسجد کا کھلا ہوا دروازہ، اُس کے اُوپر محراب، اُس کے پیچھے آسمان! غالب نے پھر آہ بھری۔ آنکھیں کچھ نم ہو گئیں۔ اُسی چہرے پر ایک شعر گونجا:

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مرزا اُلٹے پیروں لوٹ آئے۔ موجڑی پہنی اور گلی پار کر، اپنے گھر کی طرف چل دیے۔ اِس پہ ایک اور شعر گونجا:

ہُوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہُوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھا، نہ کہیں مزار ہوتا

کسی آدمی نے گلی پار کرتے ہوئے مرزا کو آداب کہا۔ مرزا نے ہاتھ اُٹھایا، جواب میں 'آداب' بُدبُدایا۔ گھر کے دروازے کی چوکھٹ کے نیچے پتھر پر بیٹھ گئے۔ اندر سے بیگم کی آواز آئی۔

"لوٹ آئے؟"

مرزا نے بیگم کی طرف دیکھا بھی نہیں بس بیٹھے رہے۔

"بڑے تڑکے اُٹھ گئے تھے آج تو!"

بیگم ہم عمر تھیں مرزا کی۔ مرزا نے جواب میں کچھ نہیں کہا بس اپنی لاٹھی زمین پر ناپتے رہے۔ بیگم پردے کے پیچھے سے جھانک رہی تھیں۔ مرزا کو لگا کہ بیگم کی نظریں اُن کی پیٹھ میں گڑھ رہی ہیں۔ بیگم کچھ مایوس سی ہُوئیں۔

"گئے نہیں؟"

پھر رُک کر بولیں۔

"ابھی بھی وقت ہے۔ صُلح کرلو اللہ سے۔"

اب جا کے مرزا نے مُنہ کھولا۔ جیسے اپنے آپ ہی سے مُخاطب ہوں ۔

"کس مُنہ سے جاؤں؟ ستر سال سے بُلا رہا ہے۔ دِن میں پانچوں وقت آواز دی اُس نے ... میں...اُس کے وفاداروں میں نہ تھا بیگم .... اب اُس سے نہیں۔ خود سے شرمندہ ہوتا ہوں۔"

اچانک مرزا کی نظر ایک کنچے پہ پڑی جو گلی کی دُھول میں چمک رہا تھا۔ مرزا نے کنچہ اٹھایا۔ اور اسے دیکھتے رہے۔ بیگم نے وہیں چوکھٹ ہی سے پوچھا۔

"کیا ہے؟"

مرزا نے کنچہ دِکھاتے ہوئے کہا۔

"کنچہ ہے۔ کسی لمڈے (لونڈے) کا رہ گیا....کھیلو گی؟"

بیگم نے کہا۔

"یہی کھیلا کرتے تھے۔ جب نِکاح پڑھ کے لائے تھے ہمیں۔"

مرزا کو شرارت سُوجھی۔ آنکھوں میں ایک عجیب سا نشہ چھا گیا۔

"تُم نے....ہمارے کنچے جو چھپا لیے تھے.... بیگم! وہی طریقہ تھا اپنی گولیاں نکلوانے کا ....گھر ہی لے آیا تُمھیں۔ گولیوں سمیت !"

مرزا اپنی بیگم کے قریب آ گئے اور یادوں کی اُسی خُماری میں پوچھا۔

"آ جاؤ...کھیلنا ہے؟"

بیگم نے اپنی عمر دیکھی۔ مرزا کا سِن دیکھا۔

"ہاں! اب یہ کنچے کھیلنے کی ہی عمر رہ گئی ہے؟"

مرزا نے اَز راہِ مذاق کہا۔

"پوتے پوتیاں بھی تو نہیں ہیں کھیلنے کے لیے کہ اُنہیں سے کھیل لُوں۔"

مرزا کی آواز میں اب بھی مذاق تھا۔ لیکن بیگم کو اُس میں شکایت کی دُھن سُنائی دی۔

" تو ہمیں الزام کیوں دیتے ہو...ہم نے تو اللہ کے فضل سے سات اولادیں دیں...اب اُن کے زندہ رہنے میں اللہ کی منشا نہیں تھی۔ تو ہم کیا کریں۔"

مرزا پھر بیگم سے مُخاطب ہُوئے۔

''تمہیں الزام دیتی ہوا سے۔ ہم نے تو کبھی کچھ نہیں کہا۔ سجدے میں نہیں گئے تو شکوہ بھی نہیں کیا۔''
بیگم خاموش رہیں اور اندر چلی گئیں۔ مرزا نے بیگم کو جاتے دیکھا۔ اُنہوں نے عین دروازے کے سامنے گتھی بنائی۔ کنچہ اُنگلیوں میں پکڑ لیا اور اُسے گتھی میں پھینکنے کے انداز میں کھڑے ہو گئے۔

2

گلی قاسم جان

وہی مرزا غالب کی حویلی کی گلی وہی مرزا ہاتھ اُوپر اُٹھائے اُنگلیوں میں کنچہ دھرے، وہی سامنے گتھی۔ کسی کے گزرنے کی آہٹ ہوئی۔ مرزا نے مڑ کے دیکھا۔ ایک نوجوان ہاتھوں میں ایک سفید کبوتر تھامے پاس سے گزر رہا تھا۔ نوجوان نے ہاتھ پیشانی کی طرف اُٹھاتے ہوئے مرزا کو سلام کیا۔

'' السلام علیکم اسد مرزا ''

مرزا نے سلام کا جواب بھی دیا اور سوال بھی کیا۔

'' وعلیکم اسلام..... کیوں میاں! لقے ہیں؟''

'' کہاں جناب لقے لکھنؤ کے؟ اُڑ گئے جب سے فرنگی آئے ہیں۔''

''اِس شہر دلی میں نہیں اُڑتے کبوتر ؟''

نوجوان نے فقرا کسا.....

''خاک اُڑتی ہے میاں نوشہ! کبھی قلعہ تک جا کے دیکھو! آپ تو اِس گلی قاسم جان سے باہر جاتے نہیں آج کل۔ چہروں کے رنگ اُڑ گئے ہیں۔''

مرزا نے آہ بھری۔

''جاؤں تو کہاں؟..... کس قلعے میں؟ باشاہ (بادشاہ) ظفر تو جلائے وطن ہو گئے۔ انگریزوں نے اُنہیں رنگون بھیج دیا.....اور شہزادوں کے سر لٹکا دیئے خونی دروازے پر..... اب میرا کون ہے اُس قلعہ میں؟''

نوجوان کو یہ جواب ناگوار گزرا۔ طعنہ دیا۔

''انگریز تو ہیں...! آپ کا وظیفہ تو بحال کر دیا اُنہوں نے۔ آپ تو بہت خوش ہوں گے اُن سے .... باشاہ (بادشاہ) نہیں تو کیا؟''

مرزا کو بات چُبھ گئی۔

''دیکھو میاں؟ شکایت ہم سے نہیں، خود سے کرو۔ تو میں بادشاہوں سے نہیں، عوام سے بنتی ہیں۔اور آپ اگر آج بھی کبوتر نہ اُڑا رہے ہوتے تو یہ مُلک کچھ اور ہوتا۔ یہ قوم کچھ اور ہوتی!........ جاؤ کبوتر اُڑاؤ!''

نوجوان کو ٹھیس لگی۔ یہ چوٹ اُس کے کردار پر تھی۔ اُس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا اور اپنی راہ چلا گیا۔ مرزا نے اپنا کنچہ سنبھالا۔ بانہہ اُٹھا کر نشانہ سادھا اور کنچہ پھینکنے کے لیے تیار ہوئے کہ اسی بیچ ایک (نابینا) سُورداس ایک سُورداسی بھجن گاتا ہوا گلی قاسم جان میں داخل ہوا۔

''سب ندیاں جل بھر.....''

سوُرداس کا ہاتھ تھامے ایک لڑکی تھی سُورداس اُن کے دروازے پر آ کر رُک گیا اور صدا دی۔

''مائی!''

آٹے کا کٹورہ لے کر امراؤ باہر آ گئیں۔ اُنھوں نے آٹا سُورداس کی جھولی میں ڈال دیا۔ سُورداس نے ہاتھ اُٹھا کے آشیش دی اور آگے چل پڑا۔ دیر تک اُس کی آواز گلی میں گُونجتی رہی۔ مرزا سُنتے رہے، بولے۔

''یہ برہمن گاتا بہت اچھا ہے۔''

مرزا کو باہر کھڑا دیکھ کے بیگم بولیں۔

''اب اندر نہیں آیئے گا کیا؟''

''اندر کیا ہے بیگم؟ کچھ خالی بوتلیں اور شکستہ پیالے؟ بس!''

بیگم کو بوتل اور پیالے کی بات اچھی نہیں لگی تنک کر بولیں۔

''باہر پھنکوا دوں اُنہیں؟''

مرزا نے سر ہلا کر نہ کہا اور ایک شعر پیش کیا۔

گو ہاتھ کو جُنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

بیگم کی نظر میں یہ کُفر تھا۔ کھیج کے اُنہوں نے کہا۔

''آ جایئے اندر! کچھ نہیں تو گھر تو ہے۔ غارت شدہ ہی سہی!''

بیگم اندر گئیں۔ مرزا نے مُسکراتے ہوئے ایک شعر کہہ دیا۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

پھر وہی کنچہ۔ وہی اٹھی ہوئی بانہہ۔ وہی کھڑے ہونے کا انداز۔ اب کی بار نشانہ سادھ کر مرزا نے کنچہ پھینکا اور کنچہ گُتھی میں چلا گیا۔ ماضی کی ایک یاد نے سر اُٹھایا۔

3

گلی قاسم جان۔

وہی حویلی۔ وہی ڈیوڑھی کے سامنے گُھتی۔ اِس گُتھی میں ایک چھنک کے ساتھ مٹھی بھر کنچے پھینکے گئے۔ کُچھ گتھی میں پہنچے کُچھ باہر گرے۔ ایک شور کے ساتھ جیتنے والے لڑکے نے جیتے ہوئے کنچے اٹھا لیے۔ ایک لڑکے نے کہا۔

''اسد ـــــ چلو اب تمہاری باری ہے۔''

پھر دوسرے کی بازی۔ بنٹے سے کنچے ٹکرائے۔ اسد نام کا لڑکا اپنے کنچے اٹھانے کے لیے جو آگے بڑھا تو ایک بزرگ اُس سے ٹکرائے۔ اسد نیچے گرا اور غصے میں چلایا۔

''دیکھ کے نہیں چلتا بڑھو!''

بزرگ کو لڑکے کی بدتمیزی اور بدکلامی ناگوار گزری۔ اس نے ڈانٹ پلائی۔

''اے لمڈے! بزرگوں سے اس طرح بات کرتے ہیں؟''

اسد نے واپس وار کر دیا فارسی میں۔

'' بزرگ بہ عقل است نہ بہ سال......''

بزرگ فارسی نہیں جانتے تھے پھر بھی اُنہیں ایک زبان دراز لڑکے کی بات اچھی نہیں لگی۔

''کیا؟''

'' بوڑھے ہو میاں، بزرگ نہیں!''

بزرگ آگے آیا اور اسد کے کان مروڑے اور پوچھا:

''کیا نام ہے تُمہارا؟''

'' اسداللہ ''

''اچھا الٰہی بخش کے داماد ہو؟ کہاں ہے تمہارا سسُر ؟''

اسد بگڑ گیا اور ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

'' دھکا مجھے دیا اور پتہ سسرال کا پُوچھتے ہیں آپ؟''

'' بڑے ہی زبان دراز ہو۔ بڑی لمبی زبان ہے تمہاری۔''

''ہاں ہے۔ فارسی زبان ہے۔ سمجھ میں آتی ہے؟''

لیکن بُزرگ کو اتنا دھیرج کہاں کہ زبان کی خوبصورتی اور باریکی پر غور کرے۔ وہ کان پکڑے اسد کو الٰہی بخش کے گھر کے بھیتر لے گیا۔

''چلو اندر.... بتاتا ہوں تمہارے بُزرگوں کو۔ ذرا اُن کے سامنے کہنا کہ بوڑھے ہیں یا..''

4

اسد کا کان کھینچ کر بوڑھا ڈیوڑھی میں داخل تو ہُوا لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ اُس نے اپنی آمد کی اطلاع گھر والوں کو نہیں دی۔ اُس نے اسد کے سسر الٰہی بخش معروف کو آواز دی۔

'' معروف میاں! اندر آ سکتا ہوں۔''

معروف میاں اُس وقت اپنے دوست مولوی صمد صاحب کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔ ہاتھ میں پیادہ تھا۔ باہر کی طرف دیکھا۔ جانا پہچانا چہرہ تھا میاں رمضانی کا۔ وہیں سے جواب دیا۔

''کون رمضانی؟ آجاؤ میاں۔ آواز تو اندر سے ہی آ رہی ہے۔''

بوڑھا رمضانی اندر آ گیا اور اُن کے آگے آگے اسد تھا جس کا کان اُس نے ابھی تک پکڑ رکھا تھا۔ اُس نے اسد کو سامنے دھکیلا اور کہا۔

''چلو بتاؤ، کیا کہا تھا تُم نے؟''

الٰہی بخش معروف نے حقہ کی نلی منہ سے نکالی اور پوچھا۔

''کیا ہُوا؟ کُچھ کیا اسد نے؟''

'' جی ہاں! ـــــــ فرماتے ہیں میں بوڑھا ہوں۔ بُزرگ نہیں۔''

معروف نے مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ اُن کے ہونٹوں پہ مُسکراہٹ تھی۔

''کیوں اسد میاں! آپ نے کہا تھا؟''

اسد حاضر جواب ٹھہرا۔ پھٹ بول پڑا۔

''جی نہیں! کہا تو شیخ سعدی نے تھا۔ میں نے تو صرف دوہرایا تھا۔''

معروف اور مولوی صاحب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اب کی مولوی صاحب نے پوچھا۔

''کیا کہا تھا شیخ سعدی نے؟''

''کہا تھا۔ بزرگ بہ عقل است نہ بسال

امیر بہ دل است نہ بمال''

دونوں دوست ہنس پڑے۔ بوڑھے کو بہت بُرا لگا۔ وہ اپنے غصے کو روک نہیں پایا۔

''آپ لوگ ہنس رہے ہیں اس بات پر!''

معروف میاں سے رمضانی کی حالت دیکھی نہ گئی۔ اُنہوں نے اسد کو وہاں سے ہٹانے کے لیے اُنہیں چلم بھر لانے کا حکم دیا۔

''دیکھو بیٹے۔ یہ چلم لے جاؤ۔ تازہ کر کے لاؤ۔''

اسد چلم لے کر بھیتر گیا۔ معروف میاں نے رمضانی کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''نہیں رمضانی! میں نہیں مانتا کہ یہ شعر شیخ سعدی نے تمہارے لیے کہا ہوگا۔''

رمضانی کو معروف میاں کی چہل اچھی نہیں لگی۔

''دیکھئے میاں الٰہی بخش یہ مسخری، مذاق کی بات نہیں ہے۔ اس لڑکے کو تمیز سکھائیے کچھ، ورنہ...''

معروف میاں کے تیور بدلے۔

''ورنہ! ورنہ کیا کروگے؟''

میاں رمضانی طیش میں آ گئے۔

''لوہارو کے نواب سے شِکایت کر دُوں گا۔''

معروف میاں ہنس پڑے۔

'' وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ تمہاری طرف داری نہیں کریں گے۔ ایک کام کرو میاں! قلعے میں چلے جاؤ۔ باشاہ (بادشاہ) ہیں۔ اُن سے شِکایت کردو۔ وہ خود کچھ نہ کر پائے تو کمپنی بہادر تک ضرور تمہاری شکایت پہنچا دیں گے۔''

مولوی صاحب نے دیکھا کہ بات بگڑ جائے گی اُنہوں نے معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔

''معروف بھائی! آپ تو بچوں کی طرح لڑ رہے ہیں اُن سے، بھائی رمضانی! تم جاؤ! ہم سمجھا دیں گے اسد کو ۔آئندہ اس طرح کی بات نہیں کریں گے وہ۔''

رمضانی بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

'' چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں سبحان اللہ۔''

رمضانی کو جاتے دیکھ میاں معروف نے شطرنج کی طرف اشارہ کیا۔

'' چال چلیے مولوی صاحب۔خوامخواہ کھیل میں خلل ڈال گیا رمضانی۔ باہر بھی یہی کیا ہوگا بچوں کے ساتھ۔''

مولوی صاحب نے جواب نہیں دیا۔ وہ بساط کو دیکھتے رہے۔ اتنے میں چلم پھونکتا ہوا اسد داخل ہوا۔ مولوی صاحب نے موہرہ بڑھا کر چال چلی اسد نے چلم حُقہ کے اوپر جمادی مگر اُس کی نظر بساط پہ تھی۔

''آپ کی چال ہے بندہ نواز !''

مولوی صاحب کی چال پر اسد اُچھل پڑا، اُس نے سُسر کو اپنی رائے دی۔

''گھوڑا دوڑا لیجیے ابا جان۔''

معروف میاں سوچ میں پڑ گئے مولوی صاحب بھی چونکے۔

''اُوں؟''

اسد نے اپنی بات دوہرائی۔

''دوڑا لیجیے۔''

'' وہ وزیر مار لیں گے بھائی!''

'' مارنے دیجیے۔''

مولوی صاحب نے پوچھا۔

''کیا بات کرتے ہو۔ وزیر دے کر کوئی کھیل سکتا ہے؟''

''آپ مارنے تو دیجیے۔''

مولوی صاحب شش و پنج میں پڑ گئے۔

''ایسے کیسے بھئی! شطرنج آتی ہے تمہیں؟''

''آپ وزیر ماریئے تو ہم بتائیں گے۔''

معروف میاں نے اپنی چال چلی۔مولوی صاحب نے وزیر مار دیا۔اسد نے گھوڑا چل دیا۔

'' یہ لیجیے شہ اور یہ مات۔''

دونوں کھلاڑی دیکھتے رہ گئے۔

''ارے واہ! یہ تو سُوجھا ہی نہیں!''

اسد ہاتھ اُٹھا کر آداب بجالایا۔ مولوی صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ اُنھوں نے معروف سے پوچھا۔

''لڑکا ذہین ہے۔ شطرنج کس سے سیکھی ہے؟ آپ سے؟''

معروف ہنس پڑے۔

''لیجیے! ہم سے سیکھتے تو یہ ذہانت ہوتی....آگرے میں مولوی معظم صاحب سے فارسی بھی سیکھی اور شطرنج بھی ...اور اس عمر میں شعر کہتے ہیں فارسی میں اور اُردو میں.... فارسی میں بیدل بننا چاہتے ہیں۔''

''بہت خوب۔ تخلص کیا فرماتے ہیں۔''

'' اسد!''

مولوی صاحب نے پھر تفتیش کی۔

''وہیں رہتے ہیں آگرہ میں؟''

''نہیں .... گھر جوائی بنا کر لایا ہوں انہیں۔ اب یہیں رہیں گے دلّی میں۔''

پھر بساط بچھی ہے۔ مگر مولوی صاحب اسد کے بارے میں پُوچھتے رہے۔

''تو آگرہ میں کون ہیں؟''

''والدہ ہیں اور ایک چھوٹے بھائی ہیں۔ یوسف علی خان!''

''اور والد؟''

''والد نہیں ہیں۔ ریاست الور کے راجہ بختاور سنگھ کے یہاں ملازم تھے۔ وہیں خانہ جنگی میں ایک گولی کے شکار ہو گئے تھے۔ پھر ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے اپنی حفاظت میں لے لیا انہیں آگرہ میں۔''

''وہ تو مرہٹوں کی طرف سے صوبیدار مقرر ہو گئے تھے وہاں!''

''جی ہاں! شاید اکبرآباد کے وہی۔ لیکن جب آگرہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تو صوبیداری کمشنری میں بدل گئی۔ اور ایک سال پہلے ایک مہم پر اچانک ہاتھی سے گر کر موت واقع ہو گئی۔ تب سے ..... یہ کیا میں ہاتھی پر تھا اور آپ نے گھوڑا چل دیا۔''

معروف میاں اسد کے بارے میں بتاتے بتاتے بساط کی چال پر چونکے۔ مولوی صاحب نے مُسکرا کر کہا۔

''کُچھ الگ چال چل کے دیکھیں۔''

''آئندہ اسد میاں کے ساتھ بیٹھ کے سیکھیں گے۔''
معروف میاں نے چال چلتے ہوئے مولوی صاحب سے گزارش کی۔
'' ایک نوازش کیجیے مولوی صاحب۔ اسد کو اپنی شاگردی میں لے لیجیے۔ بڑا تیز گھوڑا ہے۔ چل نکلے گا۔''

5

شام ڈھل چکی تھی۔ چراغ جل چکے تھے۔ گھر کی بیٹھک میں معروف میاں اسد کو ایک خط لکھوا رہے تھے۔

''آگے خود ہی لکھ دو بھئی! ہم سے کیا پوچھتے ہو! وظیفہ دس ہزار کا تھا۔ کٹ کے پانچ ہزار رہ گیا۔ آدھے کے حقدار تم دونوں بھائی ہو۔ آدھا تمہارے چچا کے صاحب زادے شمس کو ملتا۔ اب یہ حاجی ایک اور حصہ دار پیدا ہو گئے ہیں۔ لارڈ لیک کو سمجھا کے لکھ دو کہ وہ تمہارے رشتے داروں میں نہیں ہیں۔ خوامخواہ کے حصہ دار بن بیٹھے ہیں۔

اسد نے اپنے دل کی بات کہی۔
''ہمیں تو اس میں شمس اور حاجی کی سانٹھ گانٹھ لگتی ہے۔''
''یہی لکھ دو سمجھا کے۔ اور کیا!''

الٰہی بخش معروف اپنے دیوان خانہ میں چہل قدمی کرنے لگے۔ پھر اپنے تخت پر بیٹھ گئے۔ اسد اپنی عرضی لکھتے رہے۔ دری پر بیٹھے ہوئے سامنے چوکی پر کاغذ قلم اور دوات رکھے تھے۔ معروف میاں نے تخت پر پڑا ہوا ایک اُردو کا رسالہ اُٹھایا اور اُس کے صفحے پلٹنے لگے۔ اچانک ایک غزل پر اُن کی نظر ٹِک گئی۔ اُسے دبے ہونٹوں پڑھا پھر اونچی آواز میں دہرایا۔

اِس جفا پر بُتوں سے وفا کی
میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

''یہ کیا شعر لکھا ہے اسد؟ بہت خراب شعر ہے یہ۔''
اسد نے سُن کر کہا۔

''میرا نہیں ہے چچا حُضور۔ یہ اسد کوئی اور ہیں۔''

معروف میاں نے تشویش ظاہر کی۔

'' پھر تو اِن کے تمام بُرے شعر تمہارے نام منسوب ہو جائیں گے۔''

''جی ہاں! اور میرے اچھے شعر میرے نام سے منسوب نہیں ہوں گے۔''

'' تو پھر تم اپنا تخلص بدل لو۔''

''جی ہاں! سوچتا ہوں غالب رکھ لوں!''

معروف میاں کو داماد کا تخلص پسند آ گیا۔ وہ اُسے بار بار دہرانے لگے۔

''غالب۔ اسداللہ خان غالب۔ اچھا ہے پر بہت بڑے لگتے ہو بھئی۔ نام سے ہی داڑھی مونچھ دِکھائی دینے لگتی ہے۔ غالب، غالب دہلوی، نہیں صرف غالب۔

''پسند ہے آپ کو؟''

''اُوں۔ ذرا غور کر لیں۔ اور غور و غوض کے لیے ذرا..... تم مدد کرو!''

اسد نے معروف میاں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''الماری میں شربت کی بوتل پڑی ہے...وہ لادو۔''

اسد مُسکرا کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ الماری سے اُنھوں نے ایک چوکور بوتل نِکالی۔ آدھی خالی تھی۔ اسد نے کارک کھینچ لیا۔ اور زبان پر رکھ کر اُس کا ذائقہ چکھ لیا۔ پھر بوتل لے کر معروف میاں کے پاس آ گئے۔ معروف میاں نے اسد کے ہاتھ سے بوتل لے لی۔

''ذرا گلاس بھی لادو بھئی۔ اور ہاں ....ذرا نیچے کہہ دو۔ کُچھ بادام پستہ بھی ساتھ میں بھُون دیں۔''

''نیچے، کس سے کہہ دُوں؟''

''امراؤ سے کہہ دو بھئی۔ اپنی بیگم سے۔''

''اُنھیں کُچھ آتا تو ہے نہیں، اِتنی سی ہیں۔ خوامخواہ کہیں ہاتھ واتھ جلا لیں گی۔''

معروف ہنس پڑے۔

''اوہو! اتنی فِکر مت کرو تم۔''

معروف لکھنے کی چوکی کے پاس گئے وہاں سے آدھا لکھا ہوا خط اُٹھایا اور اُسے پڑھنے لگے۔ اتنے میں نیچے سے اسد میاں آ گئے۔ اُن کے پاس معروف میاں کے غور خوض کا پورا سامان تھا۔ چکھنے کے لیے بھُنے ہوئے سُوکھے میوے۔ پانی کی صراحی اور ایک کانچ کا نقشیں دار گلاس۔ اسد بتانے لگے۔

"یہ گلاس دیا ہے کہ آپ اِس میں....."

اچانک اسد کا توازن بگڑا، معروف میاں نے تاکید کی۔

"سنبھل کے ....."

لیکن تاکید سے پہلے ہی نقیش دار گلاس نیچے آ گرا اور ایک جھنجھناتی آواز کے ساتھ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ معروف میاں اسد کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

6

وہی گھر۔ وہی دیوان خانہ، کئی سال بیت گئے۔ اب اسد مرزا غالب کی عمر 25 سال تھی اور وہ ترنم میں اپنے کچھ شعر پڑھ رہے تھے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

شام ہو رہی تھی۔ امراؤ چراغ رکھنے دیوان خانے میں چلی آئیں مرزا نے مُسکرا کے اگلا شعر پڑھا۔

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ، بیمار کا حال اچھا ہے

شعر کہنے کے ساتھ ساتھ مرزا نے اپنے رومال میں گرہیں باندھ لیں۔ اور اپنے دیوان (تخت) کے پاس آ گئے۔

دیکھیے پاتے ہیں عُشاق بُتوں سے کیا فیض
اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے ، جنّت کی حقیقت لیکن
دِل کے خوش رکھنے کو ، غالب یہ خیال اچھا ہے

شعر کہتے کہتے وہ گاؤ تکیے پر کُہنی ٹیک کے لیٹ گئے اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

دو

1
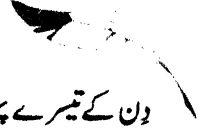
دن کے تیسرے پہر ایک ایکہ گلی قاسم جان میں داخل ہوا اور مرزا غالب کے گھر کے پاس رُک گیا۔
مرزا کے بچپن کے دوست لالہ بنسی دھر نے ایکہ رُکوایا تھا۔

"بس بھیّا ...یہیں روک لو۔"

کوچوان نے ایکہ روک کر پوچھا۔

"یہی مکان ہے مرزا کا؟"

"ہاں! ذرا یہ ٹوکری اُتروا دو بھائی ۔"

کوچوان نے کمہڑوں کی ٹوکری اُتاری۔ مرزا کے مکان کو غور سے دیکھا اور پھر بنسی دھر سے کہا۔

"آگرے والے کلاں محل سے بہت چھوٹا لگتا ہے یہ مکان۔"

"اچھا؟.....مرزا کو جانتے تھے آگرہ میں؟"

کوچوان جانتا بھی تھا اور پہچانتا بھی تھا۔

"جی ہاں چھٹپن میں ....آپ دونوں دوستوں نے راجہ بلوان سنگھ کے بہت پتنگ کاٹے تھے.....آپ اور مرزا کلاں محل کی چھت سے پتنگ اُڑایا کرتے تھے....اور ہم لوٹا کرتے تھے۔"

اتنے میں مرزا کی نوکرانی وفادار دروازے پر آ گئی۔ بنسی دھر کو پہچان کر۔ تُتلاتی آواز میں آداب بجالائی۔

"تسلیم علف کلتی (عرض کرتی) ہوں حضول (حضور)۔"

بنسی دھر نے گرم جوشی سے جواب دیا۔

"آداب وفادار! مرزا ہیں نا گھر میں؟"

"غُسل کل لہے ہیں (غُسل کر رہے ہیں)۔"

"اور بیگم؟"

"زنانے میں ہیں... کُچھ پلوسنوں (پڑوسنوں) سے گُفتگو فلما لہی ہیں۔(فرما رہی ہیں)"

''اچھا! ہمارا سلام کہنا۔ اور کلّو کو بُلا لو کہو یہ ٹوکری اُٹھا کر لے جائے ...رکھا دے رسوئی خانے میں۔''
وفادار کلّو کو بلانے چلی گئی۔ بنسی دھر نے کوچوان بدّو میاں سے کہا۔
''بدّو میاں۔ یہ بغل ہی میں ایک سرائے ہے۔ وہیں یہ ایکہ کھول لو جا کے ....آگرہ تو اب کل ہی چلیں گے۔ آج رات تو ہم ٹھہریں گے اپنے دوست کے یہاں!''
کوچوان کو اپنی بیٹی کی یاد آئی۔ اِتنا دور آئے ہیں تو مل ہی لیں۔ اُس نے اپنی منشاہ بیان کی۔
''تو ہم بھی اپنی بیٹی کے ہاں جا کے ٹھہر جائیں۔ یہیں بیاہی ہے۔ تا میں ....کل صبح حاضر ہو جائیں گے۔''
بنسی دھر کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔
''بالکل واجب ہے ..... تو ایک کام کرو۔ .ہ اوالا کمہڑہ لے جاؤ بٹیا کے لئے ...خالی ہاتھ نہیں جاتے...''
بدّو میاں نے کمہڑہ اُٹھا لیا۔
''شکریہ جناب۔ بہت بہت مہربانی۔''
بدّو میاں ایکہ لے کر چلے گئے۔ کلّو نے آ کر ٹوکری اٹھا لی اور بنسی دھر کلّو کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہو گئے۔ لیکن پہلے کھانسا ضرور۔

2

لالہ بنسی دھر ابھی برآمدے ہی میں تھے کہ چک کی اوٹ میں بیگم آ کر کھڑی ہو گئیں۔
''آداب عرض کرتی ہوں لالہ جی!''
بنسی دھر رُک گئے۔
''آداب بھابھی۔ کیسی ہیں آپ؟''
''شکر ہے اللہ کا۔''
''مرزا کیسے ہیں؟ ہمارے یار کو تو آپ نے بس دلّی کا ہی کر لیا۔ آگرے کا رُخ ہی بھول گئے۔''
بیگم نے صفائی دی۔
''ابھی پرلے روز ہی آپ کو یاد کر رہے تھے۔''

رسمی گفتگو یہیں ختم کر کے بنسی دھر اصلی بات پر آ گئے۔

'' قلعے تک پہنچنے کا کوئی وسیلہ بنا کہ نہیں ابھی؟''

امراؤ بیگم خاموش رہیں۔ یہ خاموشی بڑی ہی معنی خیز تھی بنسی دھر نے بات آگے بڑھائی۔

'' آپ کی خاموشی میں شِکایت سُنائی دیتی ہے بھابھی۔ کیا بات ہے؟''

''بھائی صاحب کیا عرض کروں؟ اِن کی ضِد اور اَنا سے تو آپ واقف ہیں۔''

بیگم کا دھیرج ٹوٹ گیا۔

''میوہ فروشوں سے اُدھار مانگ لیتے ہیں۔ لیکن کسی صاحبِ اعلیٰ کا احسان لینے کو تیار نہیں۔''

بنسی دھر اپنے یار کی ادا سے واقف تھے۔

''قرض مانگتے ذرا بھی نہیں جھجکتے لیکن احسان لیتے ہوئے وہ شرم سے زمین میں گڑ جاتے ہیں۔''

بنسی دھر نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

'' ابا تھے جب تک، کسی سے کہہ سُن لیا کرتے تھے۔ اب وہ بھی نہیں، کہ کوئی سفارش ہی کر دیں۔''

امراؤ بیگم روہانسی ہو گئیں۔ گلا بھر آیا۔ بنسی دھر نے اُس کی شِدّت محسوس کی۔

''اُٹھنا بیٹھنا بھی ـــــ ایسے کم ظرف لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہے کہ، ہمیں تو بالکل نہیں بھاتا..... شراب اور جُوا بھی کہیں زیب دیتا ہے اُنہیں؟''

الزام غلط نہیں تھے۔ بنسی دھر نے نظریں جھکا لیں۔ بیگم اب کُچھ سنبھلیں۔

'' لِللّٰہ! یہ نہ سمجھیے گا میں شوہر کی شِکایت کر رہی ہوں۔ آپ بچپن کے دوست ہیں اُن کے... اِس لیے زبان کُھل گئی۔''

مِرزا غالب تازہ تر ہو کر اِس بیچ پہلی منزِل پر آ گئے۔ اُنہوں نے دوست کو دیکھا۔ چلمن کے پیچھے اپنی بیگم کو بھی دیکھا۔ ہنس کر بولے۔

''ارے بنسی دھر! آتے ہی عدالتِ عالیہ میں سُنوائی ہو گئی....کہاں رہے اِتنے مہینے ـــ''

بنسی دھر نے شِکایت کی۔

'' تُم ہی کون سے چلے آئے؟ میں تو پھر بھی پھیرا کر گیا یہاں کا !''

اِس بیچ مرزا نے کمہڑوں کی ٹوکری دیکھ لی اور مُسکرا اُٹھے۔

''ارے یہ کیا کمہڑا، کدّو اٹھا کے لے آئے لالہ؟''

'' اب آموں کی فصل بارہ مہینے تو ہوتی نہیں میاں!''

بیگم کو اپنی مہمان نوازی یاد آئی۔

''اُوپر تشریف لے جایئے۔ میں شربت بھجواتی ہوں۔''

بیگم اندر چلی گئیں اور بنسی دھر چھت کی جانب بڑھ گئے۔

3

بنسی دھر مرزا کی چھت سے پُرانی دلّی کے گردونواح کو دیکھ رہے تھے یہ چھت اور یہاں برساتی کا کمرہ مرزا کو بہُت پسند تھا۔ یہی ایک جگہ تھی جہاں اُنہیں تنہائی نصیب تھی۔ مرزا بنسی دھر کے پاس آئے۔ اُنہوں نے صفائی اور حقیقت بیان کرنا ضروری سمجھا۔

''میں جانتا ہوُں لالہ! بیگم کی شِکایت جائز ہے۔''

بنسی دھر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''جانتے ہو تو کُچھ کرتے کیوں نہیں۔''

''کیا کروں؟ تم بتاؤ ـــ گھر میں بیٹھا رہُوں؟''

بنسی دھر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھانس کہیں ہے اور چُبھن کہیں اور ہے۔ وہ کیا رائے دیتے۔ مرزا کی آواز میں ٹیس تھی، درد تھا۔

''تم جانتے ہو کہ میرا پہلا بیٹا مُردہ پیدا ہوُا۔ اور دوسرا چند ماہ کا ہو کے گزر گیا۔ اُن کے غم سے بیگم کی آنکھیں اب تک نم رہتی ہیں... گھر میں بیٹھوں تو وہ آنکھیں مُجھ سے پڑھی نہیں جاتیں..... جب بھی دیکھتا ہوُں اُن آنکھوں کی طرف..... لگتا ہے ماتم کر رہی ہیں۔''

مرزا نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''خُدا پرست تو وہ پہلے سے تھیں لیکن اب تو جیسے، خُود کو، سجدوں میں دفن کیے دے رہی ہیں۔''

بنسی دھر خاموش رہے۔ کیا جواب دیتے۔ اچھا ہوُا اِس وقت میاں کلّو نمودار ہوا۔ وہ شربت اور سوکھا میوہ لے کر حاضر ہوا تھا۔ مرزا نے ہاتھ سے ناشتہ رکھنے اور لوٹ جانے کا اِشارہ کیا۔

''روزگار کا سِلسِلہ کُچھ ہوا؟'' بنسی دھر نے پوچھا۔

مرزا نے آہ کھینچی....

"قلعے میں رسائی کا کوئی وسیلہ نظر نہیں آتا۔ چچا کی پینشن رُکی ہوئی ہے۔ یا یوں کہو جمع ہو رہی ہے۔"

" تو وقت کیسے گزرتا ہے۔"

"چند گھنٹے حاجی میر کی دُکان پر کاٹ لیتا ہوں۔ چند گھنٹے ہم خیال جُواریوں کے ساتھ جُوا کھیلنے میں کٹ جاتے ہیں۔ (مُسکرائے) کوڑیاں بہت اچھی پھینکتا ہوں، لالہ! مشق کر رہا ہوں جس روز قسمت کا پانسہ پھینکنے کو ملا۔ سب کوڑیاں اپنے حق میں اوندھی کر لوں گا۔

بنسی دھر نے شربت کا گلاس اُٹھایا اور کہنے لگے۔

" جب تمہارے سسُر گزرے۔ میں نے سوچا آگرہ واپس آ جاؤ گے۔ اپنے بھائی کے پاس...مگر لگتا نہیں تم دِلّی چھوڑو گے۔"

مرزا نے دیوان (تخت) پر بیٹھتے ہوئے گاؤ تکیے پر کہنی ٹکا دی اور ایک شعر عرض کیا۔

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ اُلفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھاویں گے کیا

4

حضرت ذوق نے ترنم میں اپنا شعر پیش کیا۔

گرچہ ہے مُلکِ دکن میں ان دنوں قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

کُچھ درباری تھے۔ کُچھ شاگرد۔ واہ واہ کی دُھوم مچ گئی۔ یہ حضرت ذوقؔ کے گھر کا دیوان خانہ تھا۔ بڑے بڑے فانوس۔ مخمل مڑھی کُرسیاں اور فرش پر قالین، بیٹھنے کے لیے نرم نرم گدے، گاؤ تکیے۔ گھر کا ماحول شاہانہ تھا، سب سہولتیں فراہم تھیں۔ درباری تعریفی کلمات کہنے لگے۔

"واہ واہ سُبحان اللہ۔"

''کیا بات پیدا کی ہے حضور نے۔''

ایک شاگرد قلم دوات لیے بیٹھا تھا۔ اُس نے التجا کی۔

''اُستادِ محترم! ذرا درج کرلوں یہ شعر۔''

لیکن ذوق اپنے کام کو بھولے نہیں تھے۔ اُنھوں نے اپنے شاگرد کو یاد دِلایا۔

''تمھیں مُشاعرے کی فہرست تیار کرنے کے لیے کہا تھا بھائی ...کیا ہُوا؟''

شاگرد نے فہرست نکال کر بڑے ادب واحترام کے ساتھ اُستاد کو پیش کی۔ حضرت ذوق نے بڑے غور کے ساتھ فہرست دیکھی۔

'' کُچھ نئے نام بھی دِکھائی دے رہے ہیں...کون ہیں یہ صاحب...اسد اللہ خاں غالب''

شاگرد نے کہا۔

''آگرہ سے آئے ہیں۔ محلہ بلّی ماران میں رہتے ہیں۔''

ذوق صاحب نے دو ایک بار نام دہرایا۔ یاد رکھنے کی کوشش کی۔

''آگرہ سے....؟ اسد ۔ اللہ ۔ خان ۔ غالب''

ایک درباری نے تھوڑی سی جانکاری بھی دی غالب کے بارے میں۔

''اِن کے دادا سمر قند سے ہندوستان آئے تھے۔ شاہ عالم کے زمانے میں اور تُرکی بُولا کرتے تھے!''

دُوسرے درباری نے جانکاری میں اضافہ کیا۔

''اور والد عبداللہ بیگ خان یہیں پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں۔ لیکن کچھ بولے نہیں۔''

درباری بھلا جملہ بازی سے کبھی باز آئے ہیں؟ ذوق نے بھی اِس نوک جھونک میں حصّہ لیا۔

''اور آپ؟ اسد اللہ خان کیا بولتے ہیں؟''

'' خُود کو فارسی کا شاعر مانتے ہیں۔''

'' خُود ہی مانتے ہیں یا کوئی اور بھی مانتا ہے؟''

''دِلّی والوں کو منوانا چاہتے ہیں!''

ذوق سوچ میں پڑ گئے

''ہُوں....اسد .....غالب''

5

سویرے لالہ بنسی دھر کی رُخصتی ہونی تھی یہ وہ میاں اپنے لے کر آ گئے تھے۔ دروازے پر دوستوں نے ہاتھ ملایا اور گلے لگے۔ غالب نے پُر شکوہ کہا۔

''اور یوں چھ ماہی مت آیا کرو لالہ! آگرہ ہے ہی کتنی دُور !''

'' میں تو ہر موسم کے ساتھ چلا آتا ہُوں، بھائی! تمہیں نہیں آتے اُس طرف!''

''اب آؤں گا۔ ذرا روزمرّہ کی جدوجہد سے فرصت ملے تو پہنچوں! یوسف میاں سے ملے ہوئے بھی بہُت دِن ہُو گئے۔''

'' تمہارے روپیے تو میں اُس تک پہنچا دُوں گا اسد! مگر....ایک بات بار بار لب پہ آ کر رہ جاتی ہے۔

'' کیا ہے؟ کہو نا؟''

'' دیکھو میرے حالات اِس وقت صحیح ہیں۔ کُچھ روپیے رکھ جاؤں؟ رکھ لو!''

غالب نے بنسی دھر کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بنسی دھر نے جلدی سے کہا۔

''لوٹا دینا جب ہُوں گے۔''

غالب ہنس پڑے

''اور نہ ہُوے تو؟''

'' یُوں بھی تمہارے ہیں۔ میری جیب اور ضمیر، دونوں سے بوجھ ہٹ جائے گا۔''

غالب نے بنسی دھر کے کندھے تھپتھپائے۔

'' دیکھو لالہ کُچھ لوگ ہیں۔ قرض دینا اُن کا روزگار ہے۔ کیوں اُنہیں بے روزگار کرتے ہو؟ اور میں نے تو ابھی تمہارے سُتلی، مانجھے کے اُدھار بھی نہیں دیے۔''

دونوں ہنس پڑے۔ اِتنے میں ایک اجنبی آ گیا۔

''آداب پیش کرتا ہُوں حضرات۔''

دونوں نے آداب کا جواب دیا۔

''جناب اسداللہ خان غالب کے لیے پیغام ہے۔ کیا آپ ہی.....''

''بجا۔ کس کا پیغام ہے؟''

'' ملک الشعرا حضرت شیخ محمد ابراہیم ذوق کا پیغام ہے۔''

بنسی دھر اور غالب دونوں نے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا۔ غالب نے اجنبی سے دعوت نامہ لے لیا۔

'' حُضور جواب کے لیے رُکوں یا....''

''جواب ہم بھجوا دیں گے۔''

اجنبی سلام کر کے چلا گیا۔ غالب نے دعوت نامہ کھول کر پڑھا۔ بنسی دھر نے پوچھا۔

''کیا فرماتے ہیں اِبراہیم۔''

'' قلعے میں مُشاعرہ ہے۔ شہزادہ فخرو کی صدارت میں! شریک ہونے کے لئے دعوت نامہ آیا ہے!''

بنسی دھر کا چہرہ کِھل اُٹھا، آنکھیں بھیگ گئیں۔

''مُبارک ہو میرے دوست۔ بہت بہت مبارک ہو۔ مُشاعرہ تم لُوٹ لو گے میں جانتا ہوں۔''

6

غالب لال قلعہ کے مُشاعرے میں گئے۔ مشاعرہ شروع ہُوا۔ حضرت مومن نے اپنا کلام سُنایا۔ مقطع پورا ہوتے ہی واہ واہی۔

تمہیں یاد ہو نہ کہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا
تُمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اُستاد ذوق شہزادہ فخرو کے قریب بیٹھے تھے۔ مومن کے کلام کے بعد شہزادے نے شمع محفل مرزا غالب کے سامنے رکھنے کا اِشارہ کیا۔ شمع محفل مرزا اسداللہ خان غالب کے سامنے لائی گئی۔ مرزا نے اپنے آس پاس دیکھا۔ اچانک محفل میں خاموشی چھا گئی۔ غالب کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔ اُنہوں نے شہزادے کو آداب کیا اور پوچھا۔

''اجازت ہے؟''

''اِرشاد!''

'' نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا ''

کوئی آواز نہیں آئی۔ کسی نے بھی مُنہ نہ کھولا۔ غالب کو صرف اپنے دل کی دھڑکن سُنائی دی۔ اُنہوں نے شعر دہرایا۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

سامعین میں خاموشی رہی۔ آگے کا شعر پڑھا۔

''کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ...''

پھر وہی خاموشی چھائی رہی۔ غالب محفل سے مخاطب ہوئے۔

'' مِصرع اُٹھائیے حضرات۔''

کسی نے مِصرع نہیں اُٹھایا، دبی دبی آوازیں ضرور سُنائی دیں۔

''ہم سے تو اُٹھتا نہیں۔ بہُت بھاری ہے۔''

''قُلی بُلوا لیجیے۔''

ہنسی چھوٹی، قہقہے لگے۔ یہاں وہ صاحبان بھی موجود تھے جو ابراہیم ذوق کے گھر پر دیکھے گئے تھے۔ ذوق نے گردن جھکا لی۔ شہزادہ فخر واُن کی جانب دیکھتے رہ گئے۔ پھر غالب کی طرف دیکھا۔ مرزا کی سمجھ نہیں آیا کیا ہو رہا ہے۔ کیا یہ اُن کے خِلاف کوئی سازش تھی۔ غالب نے فیصلہ کیا۔

'' مقطع پیش کرتا ہوں۔''

محفل میں دبا دبا شور اُٹھا۔ شہزادہ نے پوچھا۔

''غزل پوری نہیں کی آپ نے؟''

'' حُضور مِصرع اُٹھانے کے لیے قُلی نہیں ملے۔''

مُفتی صاحب نے دریافت کیا۔

''کیا صرف دو ہی شعر کہے غزل میں۔ مطلع اور مقطع۔''

''جی نہیں مُفتی صاحب۔ غزل تو پُوری کہی تھی لیکن پہلا مصرع اِتنا بھاری تھا کہ سامعین کو اُٹھانا مُشکل ہو گیا۔

باقی اشعار پڑھ دیتا تو شاید اُن کا اُٹھنا مشکل ہو جاتا۔"
شہزادہ نے کہا۔
"آپ مقطع اِرشاد فرمایئے۔"

بس کہ ہُوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتشِ دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

محفل میں پھر خاموشی چھا گئی۔ مرزا غالب نے شہزادے کو کورنش کی اور محفل چھوڑ کر آ گئے۔ اُنہیں لگا کہ ہنسی اُن کا تعاقب کر رہی تھی۔

7

رات کو مرزا غالب لئے لئے گھر آئے۔ ڈیوڑھی پر وفادار اُن کے انتظار میں تھی۔ اُس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔
"مُچھا یلا کچھا لہا مُضول ؟(مشاعرہ کیسا رہا مُضور؟)"
غالب بس مُسکرائے اور دہلیز لانگ گئے۔ وفادار پیچھے پیچھے آ گئی مرزا دالان پار کر بر آمدے میں آ گئے۔
"مُچھایلا تو لوٹ لیا ہو گا آپ نے! (مشاعرہ تو لُوٹ لیا ہو گا آپ نے!) باچھا چھلامت (بادشاہ سلامت) نے تو تاج ہی اُتال کے لکھ (اُتار کر رکھ) دیا ہو گا آپ کے سِل پے (سر پہ)۔"
غالب نے مذاق میں جواب دیا۔
"ہاں رکھ ہی دیتے لیکن میں نے اپنی ٹوپی نہیں اُتارنے دی۔"
اُنہوں نے امراؤ بیگم کو صحن میں نہیں پایا۔ اُنہیں سُونا سُونا لگا۔ آواز دی۔
"بیگم؟"
بیگم اندر کمرے میں پلنگ پہ بیٹھی کروشیہ سے کُچھ بُن رہی تھیں۔ مرزا کمرے میں داخل ہُوئے تو بیگم نے پوچھا۔
" کیسا رہا؟"

مرزا نے جواب نہیں دیا، مُسکرا دیئے۔ بیگم نے پھر پوچھا۔

''مشاعرہ کیسا رہا؟ بتاتے کیوں نہیں؟''

غالب نے سر ہلا کر سمجھایا کہ کہنے لائق کوئی بات نہیں ہے پھر ہنس کر کہا۔

'' سُنو! ذرا پیالہ اور بوتل تو نکال دو۔''

'' ذرا مزاج بگڑا کہ پیالہ۔ ذرا بات اُکھڑی کہ کوڑیاں۔ بس یہی عادت آپ کی اچھی نہیں لگتی ہمیں۔''

مرزا نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''ہم تو اچھے لگتے ہیں نہ۔ عادت سے کیا لینا تُمہیں۔''

'' محبت کو کروٹ بدلتے دیر نہیں لگتی، سکہ پلٹا تو ہمیں نفرت ہو جائے گی۔''

غالب نے لمبی سانس لے کر ایک شعر کہا۔

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا ، نہ دے ، شراب تو دے

بیگم کروشیہ چلاتی رہیں غالب نے اگلا شعر پیش کر دیا۔

دِکھا کے جُنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو مُنہ سے کہیں جواب تو دے

بیگم جان گئیں کہ یہ شعر اُنہیں سے منسوب ہے۔ اُنہوں نے وفادار کو آواز دی۔

'' وفادار!''

وفادار حاضر ہُوئی۔

''جی بیگم۔''

'' صاحب کا پیالہ بوتل چوبارے میں لگوا دو۔''

وفادار چلی گئی۔ بیگم نے پھر پوچھا۔

'' بتاتے کیوں نہیں؟ کیا ہُوا قلعے میں؟''

'' کُچھ ہوتا تو بتاتا۔ بڑھا چڑھا کے بتاتا۔ پر شومیِ قسمت کہ کُچھ ہوا ہی نہیں۔ نہایت شریف لوگ ہیں۔ جھگڑا بھی نہیں کرتے۔''

" دراصل دلّی والے آپ کو پسند نہیں کرتے۔"

" کیوں؟ میری شکل ٹیڑھی ہے کیا؟"

" شکل ٹیڑھی ہو آپ کے دُشمنوں کی میں تو کہتی ہُوں ....."

اتنے میں شیشہ ٹوٹنے کی آواز سُنائی دی۔ بیگم نے پکارا۔

" سنبھل کے وفادار ___ !"

مرزا گھبرائے۔

" ارے کہیں بوتل تو نہیں ٹوٹ گئی ___ ؟"

" آپ کے کمرے میں جانے سے ڈرتی ہے۔ کہتی ہے وہاں بلا رہتی ہے۔"

" ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ مُجھ سے بڑی اور کون سی بلا ہوگی وہاں؟"

" اُونہہ!"

کُچھ سوچ کر بیگم نے وفادار کو آواز دی۔

" وفادار! کلّو سے کہہ دو، وہ پُہنچا دے۔"

پھر مرزا غالب کی طرف دیکھ کر کہا۔

" میں کہتی ہُوں آگرہ لوٹ چلیے۔ دلّی والے آپ کو یہاں مقبول نہیں ہونے دیں گے۔"

غالب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک لمبی سانس لی اور ٹہلتے ٹہلتے کہا۔

" ہندو مسلمان، شیعہ سُنّی۔ یہی بٹوارے کیا کم تھے کہ لوگوں نے دلّی، لکھنو اور آگرہ کی دیواریں بھی کھڑی کرلیں۔ دُنیا مجھے چھوٹی لگتی ہے بیگم... یہ دُنیا ...."

غالب اچانک بیگم کے پیچھے کھڑے ہوگئے۔ اور شعر کہا۔

" بازیچۂ اِطفال ہے دُنیا میرے آگے "

بیگم نے مرزا کی طرف دیکھا۔ مرزا نے وضاحت کی۔

" بازیچہ۔ کھیلنے کا میدان "

بیگم چڑ گئیں۔

" جی اور اِطفال کے معنی بچّے۔ بازیچۂ اِطفال یعنی چھوٹے چھوٹے بچوں کے کھیلنے کا میدان۔ اِتنی اُردو ہمیں بھی آتی ہے۔"

مرزا مسکرائے اور ترنّم میں شعر کہا۔

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

مرزا نے بیگم کے دوپٹے کے کونے میں گرہ لگادی۔

اِک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اِک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

مرزا نے دوپٹے میں ایک اور گرہ لگائی اور پلنگ کے دوسرے پائے کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے آگے
گھِستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تُو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مُجھے کُفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

تین

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

[illegible]

جو لگائی نہ لگی اور بجھائی

1

پتھر کا چھاپہ خانہ انگریزوں کی بدولت ہندوستان میں آ گیا۔ پہلے اِن کتابوں کو ہاتھ سے لکھنے والے کاتب تھے۔ مغلوں کے زمانے میں کتابت نے آرٹ کی صُورت اختیار کر لی تھی۔ پھر جب پتھر کے چھاپہ خانے کھُلے دتی میں۔ لکھنو میں اور پنجاب کے کئی شہروں میں تو اُنہیں کاتبوں نے پتھر کی سلوں کا کام سنبھال لیا۔ ایسے ہی ایک کاتب تھے پرانی دتی کے نجم الدین۔ نجم الدین نے مرزا غالب کے دیوان کی کتابت سنبھال لی تھی۔ ایک صُبح جب نجم الدین مرزا غالب کے دیوان کی کتابت کر رہے تھے۔ سامنے ایک کونے میں اُن کی بیگم نے کتابت کی سیاہی اُبلنے کے لیے انگیٹھی پر چڑھا رکھی تھی۔ نجم الدین ایک غزل کی کتابت کر رہے تھے، اُنہوں نے شعر پڑھا۔

دائم پڑا ہُوا ترے در پر نہیں ہُوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہُوں میں

نجم الدین نے دوسرا شعر پڑھا۔ اور اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔

کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جائے دِل
اِنسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

بیگم نے گرم گرم سیاہی دوات میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔
"کس کا کلام ہے یوں جھوم جھوم کر پڑھ رہے ہو؟"
نجم الدین نے اگلا شعر پڑھا۔

یارب زمانہ مُجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

آہاہا کیا کمال کی بات کہی ہے۔ اِس جہاں کی تختی پر میں وہ حرف نہیں جو دوبارہ لکھا جا سکے.... یارب زمانہ مُجھ کو مٹاتا ہے کس لیے۔ کیوں مٹاتے ہو یارو؟ بیگم حیران ہُوئی۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہؤا تھا۔

" پر یہ حضرت ہیں کون؟ بڑے فریفتہ ہو رہے ہو اُن کے شعروں پر۔"

نجم الدین ابھی تک اُسی نشے میں شرابور تھے۔

"اور کون ہو سکتا ہے۔ صرف مرزا ہی یہ شعر کہہ سکتے ہیں۔"

" ارے مرزا غالب؟"

بیگم نے ماتھا پیٹا۔

" اُف اللہ! کس کنگال کا کام لے لیا۔ پھوٹی کوڑی بھی نہ ملے گی اُن سے۔ کتابت تو درکنار، روشنائی اور قلم کے دام بھی نہیں نکلیں گے۔ زمانے بھر کے قرض دار ہیں، کچھ جانتے بھی ہو۔"

" ذرا یہ دیوان چھپ جانے دو بیگم۔ زمانہ اُن کا قرض دار نہ ہو گیا تو کہنا۔ ایسے شاعر آسانی سے پیدا نہیں ہوتے۔"

بیگم بڑبڑاتی ہوئی اُٹھیں۔

" ہاں اِتنی آسانی سے مرتے بھی نہیں.... رسوئی کے لیے کُچھ پیسے ہیں کھیسے میں؟"

نجم الدین نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"ابھی اُس روز تو دو روپے دیے تھے۔"

"دو روپئے کیا مہینہ بھر چلیں گے؟"

"ہفتہ بھر تو چلتے۔ ذرا کِفایت سے کام لیا کرو۔"

نجم الدین نے کچھ ریزگاری نکال کر دی۔

2

شہزادہ فخرو کے دیوان خانہ میں کئی بزرگ شعراء اُن کے منتظر تھے اور کافی دیر سے بیٹھے تھے۔ ذوق، مومن، شیفتہ، مفتی وغیرہ۔ تبھی مفتی صاحب نے اجازت چاہی۔

"بھئی میں معذرت چاہوں گا۔ ولی عہد کو آتے شاید دیر ہو جائے۔"

مومن نے پوچھا۔

''آپ کو کہاں کی جلدی ہے قبلہ!''

''سوچتا ہوں مرزا سے ایک ملاقات کرآؤں۔ اُس روز روٹھ کے چلے گئے تھے مُشاعرے سے۔''

''کیوں مخل ہوتے ہیں اُن کی خلوت میں۔ بیچارے بیٹھے کوئی گرہ لگاتے ہُوں گے یا کھولتے ہُوں گے۔''

''گرہ لگانا تو سمجھے کہ شعر کہتے ہوں گے۔ یہ گرہ کھولنا کیا ہُوا؟'' ذوق نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے شیخ صاحب کمال کا حافظہ ہے اُس آدمی کا۔ جتنے شعر کہتے ہیں اُتنی گرہیں لگاتے جاتے ہیں رومال پر۔ صبح اُٹھ کر ایک ایک گرہ کھولتے ہیں اور شعر درج کر لیتے ہیں۔''

ذوق کو ماننا پڑا۔ حیرت سے سر ہلاتے رہے۔

''حافِظہ تو واقعی باکمال ہے۔ علم و ہُنر....''

مفتی صاحب اُٹھے اور سب کو آداب بجالائے۔

''اِجازت چاہتا ہُوں۔''

مفتی صاحب کے جانے کے بعد ذوق نے ساتھیوں سے پوچھا۔

''کوئی دیوان شائع ہوا ہے مِرزا کا یا ابھی نہیں؟''

3

مفتی صدرالدین قلعہ سے نِکل کر مِرزا کے گھر پہنچے۔ سوچا تھا اس وقت گھر پر ہی مِلیں گے۔ کوڑی پانسہ تو تیسرے پہر چلتا ہے۔ اِس وقت ضرور کچھ پڑھ لکھ رہے ہوں گے۔ یہی موقعہ ہے اُنہیں سمجھانے کا۔ دُنیا داری سِکھانے کا۔ پہنچے تو نظارہ ہی الگ تھا۔

'' آ ... آ .... آجا ....''

مِرزا ہاتھ میں دودھ کی لبالب کٹوری لیے چل رہے تھے۔

''اجی یہ نیا شوق کیا پال لیا مِرزا۔ بلّیوں کا ....''

''اجی شوق کس نامُراد کو تھا مفتی صاحب! وہ تو بنسی دھر، ہمارے یار ہیں، وہ آئے تھے آگرہ سے.... کہا تھا کمبخت، لگڑی مت لانا...... وہ.... وہ بلّی اُٹھالائے۔ بلّیاں بہُت عزیز ہیں اُنہیں۔''

مرزا نے دودھ کی کٹوری بلّی کے بچے کے سامنے رکھ دی اور بلّی دودھ پر ٹوٹ پڑی۔ مرزا بڑی شفقت سے اُسے دیکھتے رہے لیکن بات مفتی صاحب سے کیے جا رہے تھے، بنسی دھر کی، بلّی کی، بلّی کے بچّوں کی.....

''کہنے لگے.... چھ بچے دیے تھے اُن کی بلّی نے... جو بچّہ سب سے خوش رنگ تھا۔ وہ میرے لیے اُٹھا لائے ۔''

مرزا خود ہی ہنس پڑے۔

''اب کوئی اپنی اولاد بانٹے ہمارے ساتھ تو کیسے اِنکار کریں!''

مرزا، مفتی صاحب کو اُوپر دیوان خانہ میں لے گئے۔ بات ابھی بھی بلّی کی ہی ہو رہی تھی۔

''پھر بتا گئے کہ میری طرح گوشت خور ہے۔ لیکن اپنا شِکار خود ڈھونڈ لے گی اس لیے گھر میں چوہے رکھنا لازم ہو گیا۔''

مرزا کی بات سُن کر مفتی صاحب نے ہنس کر کہا۔

''گھر میں اناج کی بوریاں ہیں تو اِنشا اللہ چوہوں کی کمی نہ ہوگی۔''

''ڈرتا ہوں کہیں اناج کی کمی نہ ہو جائے۔''

مفتی صاحب مُسکرا اُٹھے اِس اللہ کے بندے کو ہر بات میں مذاق سُوجھتا ہے۔ کوئی سنجیدگی نہیں۔ زندگی کیسے کاٹے گا۔ اور جانے کی اجازت چاہی۔

''اچھا مرزا! اجازت دو .... چلتا ہُوں۔''

مرزا اُنہیں نیچے چھوڑنے چلے۔

'' پھر تشریف لائیے گا۔''

دونوں سیڑھیاں اُترنے لگے۔

مفتی صاحب جو بات کہنے آئے تھے وہ تو ہُوئی نہیں۔ پھر بھی سیڑھیاں اُترتے ہوئے پوچھا۔

''ارے بھائی مرزا۔ وہ آپ کے دیوان کا کیا ہُوا؟ وہ جو بنسی دھر لکھنؤ لے جانے والے تھے چھپنے کے لیے۔''

جب چھپے تب چھپے۔ مرزا کو کوئی جلدی نہ تھی۔ اُنہوں نے جو حقیقت تھی وہ بیان کی۔

''کوئی دو مہینے سے کاتب کے یہاں پڑا ہے۔ بس آج کل میں مکمل ہو جائے تو وہ آگرہ لے جائیں گے۔ یہ ذمّہ اُن کا۔''

سیڑھیاں اُتر کر دالان پار کیا، اور باہر آ گئے۔

''خُدا حافظ!''

''فی امان اللہ۔''

مفتی صاحب نکلے تو پلندہ بغل میں لیے نجم الدین دِکھائی پڑا۔ مرزا اُٹھ کے اور بڑی گرم جوشی سے کاتب کی آو بھگت کی۔

''بڑی لمبی عمر ہے تمہاری میاں! بس ابھی ابھی ذکر ہوا تھا مفتی صدر الدین سے!''

نجم الدین نے مسودہ پیش کیا۔

''آپ کا دیوان مکمل کر لایا ہُوں حُضور!''

مرزا نے دیوان رسید کیا اور تھڑے پر رکھ دیا۔ نجم الدین ابھی بھی مرزا کے اشعار کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ نجم الدین نے کہا۔

''حُضور! مُجھ ناچیز کی حیثیت ہی کیا کہ رائے دینے کی جُرت کروں۔ مگر آپ بہُت بڑے سخنور ہیں۔ ایک ایک شعر کوزے میں دریا بند کیے ہوئے ..... پڑھ پڑھ کے سر دُھنتا تھا۔''

مرزا کو یہ تعریف اچھی لگی۔ مرزا نے مٹھی بھر سکّے جیب سے نکال کے نجم الدین کے ہاتھ پر انڈیل دیے۔

''تمھیں دیوان لکھنے کے لیے دیا تھا نجم الدین۔ پڑھنے کے لیے نہیں۔ یہ رہی تمہاری لکھنے کی اُجرت۔''

پھر بڑی ہی سنجیدگی سے کہا۔

''اور پڑھنے کی تم دو گے!''

نجم الدین نے اُجرت لینے سے انکار کیا۔

''میں کس قابل ہُوں جناب لیکن یہ رہنے دیجیے!''

''نہ بھئی! پڑھنے کی اُجرت تو تُم نے 'داد' سے ادا کر دی۔ مُجھے بھی اپنا فرض ادا کر لینے دو!''

مرزا نے سکّے نجم الدین کو زبردستی تھما دیے۔ نجم الدین کو رقم کچھ زیادہ لگی۔

''یہ بہُت زیادہ ہیں مرزا!''

''میاں! تھوڑے خرچ کر دو۔ کم ہو جائیں گے!!''

آداب کہہ کر نجم الدین نے رُخصت لی۔ مرزا نے مسودہ اٹھایا اور اندر چلے گئے۔

4

اِدھر کتابت ختم ہوئی اور چھپوانے کے لیے بنسی دھر کو خبر بھیج دی گئی۔ مرزا کے سر میں درد تھا۔ کلّو میاں کو آواز دی۔

"کلّو میاں۔ ذرا بام کی ڈبیا تو لا دو، سر کچھ بھاری ہے۔"

کلّو میاں مُسکرا دیے۔

"مُبارک ہو حضور!"

"ایں! سر بھاری ہونے کی مُبارک دے رہے ہو۔"

"اِدھر آپ کا سر بھاری ہو رہا ہے، ..... اُدھر بیگم صاحبہ کے پاؤں بھاری ہیں۔"

اُنہوں نے پھر کلّو میاں کی طرف دیکھا۔ کلّو میاں کی آنکھوں میں چمک تھی۔

"مجھے تو وفادار نے بتایا!"

خبر تو صحیح تھی۔ گھر میں سبھی کو معلوم ہے۔ وفادار کو، کلّو کو۔ ایک میں ہی ہوں جس سے راز رکھا گیا۔

"بیگم نے ابھی تک آپ سے راز رکھا ہوا ہے۔"

جیب سے تمام ریزگاری نکالی اور کلّو کے ہاتھوں میں ڈال دی۔

"تمہارا انعام ہے کلّو۔ خوش خبری کے لیے۔"

کلّو نے انعام کے پیسے اپنے کچھے میں باندھ لیے اور سیدھا رسوئی کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ مرزا اپنا سر درد بھول گئے۔

5

'بیگم بیگم' کہتے ہوئے مرزا بیٹھک میں داخل ہوئے بیگم دیوان پر گاؤتکیوں کے سہارے بیٹھی تھیں۔

''بیگم!''

بیگم نے پلو ٹھیک سے رکھا سر پر اور کُچھ چھپاتے ہوئے مرزا کی طرف دیکھا۔ مرزا اسی دُھن میں تھے۔

''چھپ چُھپ کے کیا کھایا جا رہا ہے؟''

بیگم شرما گئیں۔ مرزا نے ہنس کر کہا۔

''ہمیں نہیں کھلائیں گی؟''

بیگم نے اِنکار میں سر ہلایا۔

'' اُوں ہُوں!''

مرزا پاس آ کر بیٹھ گئے۔

''دیکھو بھگت نانک فرما گئے ہیں۔ رُکھا سُکھا کھائے کے ٹھنڈا پانڑی پی۔''

'' پانڑی؟''

''مطلب پانی۔ پنجاب کے لوگ پانی کو پانڑی کہتے ہیں۔''

اب اُنہوں نے دیکھا کے بیگم ابھی تک کُچھ چھپائے ہوئے ہیں۔

''دیکھو رُوکھا سُوکھا سب آپس میں بانٹ کے کھانا چاہیے۔''

بیگم نے اپنے ہونٹ دوپٹے سے ڈھک لیے اور جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ایک پل۔ میں ابھی آئی!''

بیگم باہر جا کر تھوکنے لگیں۔ مرزا نے تکیہ اُٹھایا تو گاچنی مٹی کا ٹکڑا نظر آیا۔

''اوہو۔ تو یہ' گاچنی مٹی' نوش فرما رہی ہیں آپ۔''

بیگم ہونٹ پونچھتے پونچھتے اندر آ گئی۔ مرزا نے 'گاچنی مٹی' کا ٹکڑا اٹھایا۔ بیگم نے جھپٹ کر مٹی اُن کے ہاتھ سے چھین لی۔

''اللہ! یہ کیا گستاخی ہے۔''

مرزا نے اُن کی آنکھوں کو نہارا۔

''گستاخی تو ہم سے ہوئی تھی جو ..... ہاتھ پاؤں نکالنے لگی ہے؟''

''یہ کیسی بے حجابی ہے اللہ۔''

''اچھا ..... آپ نے ہمیں بتایا کیوں نہیں، راز کیوں رکھا ہم سے؟''

بیگم کے چہرے پر حیا کی سُرخی دوڑ گئی۔

''ہمیں شرم نہ آتی۔ اپنے منہ سے کہتے.....''

''اور یہ 'گاچنی مٹی' چباتے شرم نہیں آئی آپ کو؟ آپ کے ابا اللہ اُنہیں جنت نصیب کرے 'لوہارو' کے نواب، وہ سنتے کہ اُن کی صاحبزادی مٹی نوش فرما رہی ہیں تو سوچیے ہماری کیا حالت کرتے..... ارے نواب زادیاں حاملہ ہوں تو.......''

بیگم کی آنکھوں میں التجا تھی۔

''ذرا آہستہ بولیے۔ باہر نوکر کام کر رہے ہیں۔ وہ سُن لیں گے۔''

مرزا نے قہقہہ لگایا۔

''ارے اُن کی کیا مجال ہے وہ سُنیں! اُنہوں نے تب بھی نہ سُنا جب مُجھے خبر دی!''

بیگم ناراض ہو گئیں۔

''ہائے اللہ ـــــ یہ ہاتُونی وفادار ہو گی..... اُس کے پیٹ میں کوئی بات نہیں پچتی!''

لیکن مرزا کو وفادار سے کوئی دِلچسپی نہیں تھی۔ اُنہیں اپنا فرض یاد آ گیا۔ اُنہوں نے کلو میاں کو آواز دی۔

''کلو میاں! ـــــ ذرا اِدھر تشریف لائیے۔''

بیگم سمجھی نہیں کہ کلو میاں کو کیوں بُلایا جا رہا تھا۔ وہ کُچھ کہنے والی ہی تھیں کہ کلو میاں نمودار ہوئے۔ ابھی تک کاندھے پر وہ گمچھا تھا اور گمچھے کے کونے میں انعام کی رقم بندھی تھی۔

''حُضور! آپ نے یاد فرمایا؟''

''کلو میاں! بازار جاؤ اور چند ٹوکرے کچی کیریوں کے اُٹھا لاؤ بیگم کے لیے۔''

بیگم نے چٹکی کاٹی۔

''ابھی تو آم پر بور بھی نہیں آیا حُضور!''

''کیا کہتے ہو کلو میاں! ہم نے آج صبح ہی کوئیل کو چہکتے سُنا تھا۔''

'' 'اُمید' سے چہک اُٹھی ہوگی حُضور!''

مرزا کو ککلو میاں کا فقرہ اچھا لگا۔ کیا بات کہی اِس ان پڑھ نوکر نے۔

''واللہ! اُمید کی ترکیب بہت خوبصورت اِستعمال کی ہے ککلو میاں۔''

ککلو آداب بجالایا۔

''آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔''

''یوں کیجیے، پستے بادام کی بوریاں اُٹھوا لائیے آپ۔''

ککلو میاں نے کُچھ نہیں کہا۔ مالک کا انداز جانتا تھا۔ بیگم نے اعتراض کیا۔

'' بوریاں!''

مرزا نے صفائی دی۔

''اُدھار لینا بڑے فن کی بات ہے بیگم! بوریاں مانگیں تو تھیلا ملتا ہے۔''

بیگم نے آہ بھری۔

'' اِتنا اُدھار آتا ہے۔ چکے گا کیسے؟''

''سرکار کا فیصلہ آنے کی دیر ہے۔ باپ چاچا کی پینشن جمع ہو رہی ہے۔ سب وصول ہو جائے گی۔ تب دُکانیں نہیں بازار خریدا کرنا۔''

ککلو میاں بات سُن رہا تھا۔ مرزا نے بات سمجھادی۔

''چلو ککلو میاں ۔ بازار میں ہمارا چرچا تو نہیں چلتا۔ لیکن پرچہ تو چلتا ہے۔''

6

ککلو میاں کے بدلے وفادار بازار گئی۔ بنیا سامان تول چُکا تھا۔ اُس سامان کی تھیلیاں ایک بڑے ٹوکرے میں قرینے سے رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''ہاں! کب تک پینشن مِل رہی ہے مرزا کی؟''

ٹھُنلاتے ہُوئے۔

''تھولے وقت کی بات ہے۔ (تھوڑے وقت کی بات ہے) سلکال (سرکار)، ملوا (مرزا) کے چچا کی جاگیل (جاگیر) واپس کرنے والی ہے۔''

وہاں کھڑے دو تین خریدار بات سُن رہے تھے۔ ایک نے پوچھا۔

''آگرے کی؟''

''جی ہاں!''

''تو پھر مرزا آگرہ واپس لوٹ جائیں گے کیا؟''

''آگرہ کیوں جائیں گے؟ .... وہ تو میاں قلعے میں چھائل اعظم (شاعر اعظم) ہوں گے! بس تھولے (تھوڑے) دِنوں کی بات ہے۔''

دوسرے خریدار نے کُچھ اور ہی سُنا تھا وہ بیچ میں ہی بول پڑا۔

''ہونہہ ....تھوڑے وقت کی بات ہے .... چنڈو خانے میں تو کُچھ اور ہی سُن رہے تھے۔ کوئی کہتا تھا مرزا گھوڑسواری کرتے تو اچھا تھا۔ شاعری کیوں کرتے ہیں!''

پاس کھڑے لوگ ہنس پڑے وفادار نے اوڑھنی کے کونے سے گانٹھ کھول کر پیسے چُکا دیے۔

''یہ رقم آپ مرزا صاحب کے حساب میں جمع کر لیجیے۔''

لیکن لوگ جُملے کستے رہے۔

''شاعری کے علاوہ سب کُچھ اچھا کر لیتے ہیں مرزا!''

''کوڑیاں تو خوب کھیلتے ہیں۔ سُنا ہے ....''

''جی ہاں یہی حال رہا تو کوڑیوں میں ہی کھیلیں گے!''

لوگ ہنستے رہے۔ اُنہیں بڑا مزہ آرہا تھا۔ مُفت کا تماشہ تھا۔ وفادار کو بڑا ناگوار گزرا۔ لیکن اُس نے کچھ کہا نہیں۔ سامان لے کر گھر کی جانب چل پڑی۔

7

یہ محض افواہ نہیں تھی۔ مرزا غالب اچھی کوڑیاں کھیلتے تھے۔

بازار کے ایک برآمدے میں چوسر بچھی تھی۔ باری مرزا کی تھی۔ اُنہوں نے بائیں ہاتھ سے کوڑیاں کھیلیں

اور داؤ جیت گئے۔ چار آدمی کھیل دیکھ رہے تھے۔ ایک شخص نے مرزا کو داد دی۔

''آج تو قسمت زوروں پر ہے مرزا ! بہت جیت رہے ہو!''

''ہارے کب تھے ندیم میاں؟ کہتے ہیں محبت کا ہارا، جوئے میں ضرور.....''

ایک آدمی دوڑا، دوڑا آیا آگاہ کرنے کے لیے۔

''صادق صاحب! چوپڑ اُٹھا لیجیے۔جلدی .....کوتوال اِسی طرف آ رہا ہے۔''

صادق صاحب نے چوپڑ اٹھا لیا۔مرزا غالب کو حیرانی ہوئی۔ اُنہوں نے اعتراض کیا۔

''کیوں، کیوں ....کیا ہُوا؟''

''میاں اُٹھو دھر لیے جاؤ گے۔کوتوال آ رہا ہے۔''

''تو آنے دو۔کھیل لے وہ بھی! وہ کیا ہم سے اچھا کھیلتا ہے؟''

خبری نے آگاہ کیا۔

''حضرات! پکڑے گئے تو جیل جاؤ گے! جانتے نہیں جُوا کھیلنا غیر قانونی ہے۔''

تھوڑی دیر میں کوتوال گھوڑا دوڑاتے ہُوئے آ پہنچا۔ وہ گھوڑے ہی پر تھا اور مرزا سے سامنا ہو گیا، پوچھا۔

''کہیے مرزا ! کیا ہو رہا ہے۔''

''جُوا ہو رہا تھا ـــــ آپ آ گئے رنگ میں بھنگ کرنے۔''

کوتوال نے دوستانہ لہجہ میں کہا۔

''جُوا کھیلنا قانوناً منع ہے مرزا۔''

''کوئی اپنے پیسوں سے کھیلے تب بھی؟''

''اپنے گھر میں کھیلے تب بھی غیر قانونی ہے۔''

''گھروں میں لوگ کیا کرتے ہیں اس کی خبر فرشتوں کو بھی نہیں ہوتی۔آپ کو کیسے ہو جاتی ہے؟''

''شیطان کو ہو جاتی ہے مرزا ! ہمارے پاس فہرست ہے۔سب جُوا کھیلنے والوں کے نام لکھے ہیں۔''

''ہمارا بھی؟''

''جی ہاں!''

مرزا نے مُسکرا کر کہا۔

''چلو .... ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے۔''

مرزا اپنے انداز میں چل دیے کوتوال نے اُنہیں جاتے دیکھ کر 'من ہی من' کچھ فیصلہ کیا.... اب مرزا کی خیر نہیں.....

8

یہ شعر گاتے ہوئے حافِظ گُزر رہے تھے۔ مرزا سامنے آ گئے تھے۔ مرزا غالب رُک گئے حافِظ کا گانا اچھا لگا۔ پاس آ کر دریافت کیا۔

''حافِظ جی! بڑا زندہ شعر ہے۔ کس کا کلام ہے۔''

حافِظ نے آواز پہچانی۔

''کون؟ مرزا نوشہ! میر تقی میر کا کلام ہے۔ شاعر تھے دلّی کے۔''

غالب تعریف کیے بنا نہ رہ سکے۔

''واہ ! کیا انداز ہے!''

پھر دبی آواز میں چہل کی۔

''ذرا حضرت اِبراہیم ذوق کے دروازے پہ کھڑے ہو کے پڑھیے .... نااہل یہ تو جانیں کہ زبان دانی یا قافیہ بندی سے شاعری نہیں ہوتی.....ہم تو اچھے شعر کے عاشق ہیں۔ جہاں مل جائے ،جس سے مِل جائے۔''

مرزا غالب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چوپڑ میں جیتی ساری رقم حافِظ جی کے کشکول میں ڈال دی۔ سِکّوں کی جھنکار حافِظ جی نے سُنی دِل باغ باغ ہو گیا اور دُعا میں ہاتھ اُٹھ گئے۔

"اللہ رحیم رحمت کرے تم پر۔ مرزا نوشہ!"
اور گاتے گاتے آگے بڑھے۔

پتہ پتہ، بُوٹا بُوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے، گُل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

چارہ گری بیماریِ دل کی، رسم شہر حُسن نہیں
ورنہ دلبرِ ناداں بھی اِس درد کا چارہ جانے ہے

مہر و وفا لُطف و عنایت۔ ایک سے واقف ان میں نہیں
اور تو سب کُچھ طنز و کنایہ۔ رمز و اشارہ جانے ہے

1

دلّی کی دیوالی۔ جگہ جگہ فانوس جل رہے تھے۔ گلی کوچوں میں چراغان، گھروں میں بھی اور دُکانوں میں بھی۔

مرزا غالب دیوالی پر اپنے عزیز دوست اور شاعر ہرگوپال تفتہ کے گھر مدعو تھے۔ اور اُن دنوں کا چلن تھا کہ بنیوں اور کائستھ گھرانوں میں دیوالی پر جُوا کھیلنا اچھا مانا جاتا تھا۔

اب کی بازی پھر مرزا غالب نے جیت لی تو، تفتہ نے داد دی۔

''اُستاد! دیوالی پر تو آپ ہر سال جیتتے ہیں۔''

''بھئی مرزا تفتہ! جیتتا تو میں عید پر بھی ہوں۔ بس کہ عید پر رسم نہیں جُوا کھیلنے کی۔''

مہمانوں میں سے ایک نے کہا۔

''عید بھی کون سی دور ہے۔ اگلی پندھرویں میں پڑے گی۔''

دوسرے نے مذاق کیا۔

''آپ بھی کہاں رسم و رواج مانتے ہیں مرزا۔''

''یوں نہ کہو بھائی، سبھی رسمیں مانتا ہوں۔ اِس لیے کسی ایک کا قائل نہیں۔''

سبھی ہنس پڑے۔ اس بیچ لکشمی پوجا کے منتر سُنائی دیئے۔ کھیل ابھی جاری تھا۔ پُجاری آ گیا اور اُس نے سبھی مہمانوں کو تِلک لگایا، ایک مرزا غالب کو چھوڑ کر۔ مرزا نے آواز دی۔

''پروہت جی! ہم پوجا نہیں کرتے لکشمی دیوی کی۔ مگر اُس کے قائل تو ہیں..... تِلک ہمیں بھی لگا دیجئے۔ بڑی ضرورت ہے اُن کے آشیرواد کی۔ اُن کی رحمت کی۔''

پروہت جی نے مرزا غالب کو تِلک لگایا۔ مرزا نے کچھ پیسے پوجا کی تھالی میں ڈال دیے۔ ایک مہمان نے تعریف کی۔

''تِلک لگا کے بڑے خوبصورت لگتے ہو مرزا نوشہ۔''

مرزا نے شان سے کہا۔

''پورا ہندوستانی لگتا ہوں۔ بچپن میں بنسی دھر کے گھر پہ پوڑیاں کھانے کے لیے ہر پوجا میں پہنچ جایا کرتا تھا..... تِلک لگوا کر بنسی دھر سے زیادہ ہندو لگتا تھا۔''

اِس بیچ ہرگوپال کے صاحبزادے نے آ کر کہا۔

''پتا جی، میرا انار جلا دیجیے نا۔''

''ارے بھئی! خود جلاؤ جا کے۔ ہمیں کھیلنے دو۔''

غالب نے سفارش کی۔

''تفتہ! جاؤ بھئی مدد کرو اپنے بیٹے کی۔''

''آپ کی بازی تو پھر چکی۔ آپ جائیے!''

غالب کھڑے ہو گئے اور لڑکے سے کہا۔

''چلو بیٹا! ہم جلاتے ہیں۔''

آنگن میں سبھی بچے جمع تھے۔ آس پاس چراغاں تھا۔ تُلسی پودے کے پاس پوجا کا دیا۔ اگربتی اور دھوپ جل رہے تھے۔ غالب نے کہا۔

'' مہتابی دو ...''

لڑکے نے انار مرزا غالب کو دے دیا۔ غالب بچوں کے کھیل میں شامل ہو گئے۔ انار کو دیا سلائی لگائی، اور بچوں کو تاکید کی۔

''دور ہٹو ۔ ہٹو ''

اور کتنی ہی رنگوں کی چنگاریاں اُگلتا ہوا انار اچھا لگ رہا تھا۔ مرزا نظارہ دیکھتے رہے اور اس بیچ ماضی کے دریچے کھل گئے۔

ایسی ہی دیوالی کی رات تھی برسوں پہلے۔ شہر آگرہ میں۔ اِس دیوالی کی رات میں سبھی بچے اسد، یوسف، امراؤ، بنسی دھر آتش بازی دیکھ رہے تھے۔ پھلجھڑیاں جلا رہے تھے۔ چھوٹے اسد نے ایک انار ننھی سی امراؤ جان کو دیتے ہوئے کہا۔

''امراؤ جاؤ نہ، انار جلاؤ ۔ بنسی دھر! امراؤ کو انار جلانے دو۔''

''ہمیں ڈر لگتا ہے۔'' چھوٹی سی امراؤ سچ مُچ ڈر رہی تھی۔

''ڈر کا ہے کا؟ ہم ہیں نا!''

امراؤ جھجکتے ہُوئے آگے بڑھی انار جلایا۔ اسد نے شیطانی میں ایک پھلجڑی اس کے دوپٹے سے باندھ کر اُس کو جلایا۔ امراؤ چیخ پڑی۔

'' امّی !''

اور دوپٹہ وہیں پھینک کے بھاگی۔ اسد اور باقی بچے ہنستے رہے۔ پاس میں ایک پٹاخہ پھوٹا۔

مرزا غالب اسد کے بچپن کی باتوں کو بھول کر واپس ہرگوپال تفتہ کے آنگن میں آ گئے۔ تفتہ کے بیٹے کا ڈر جاتا رہا۔ اب وہ طرح طرح کی پھلجڑیاں، پٹاخے، چکری جلا رہا تھا۔ مرزا کی اب وہاں ضرورت نہ تھی۔ وہ لوٹ آئے۔

2

رات کو مرزا گلی قاسم جان لوٹ آئے۔ دروازے کے پاس پہنچے تھے کہ دوسری طرف سے شکھانند کا مُلازم چندن اور ایک نوکر مرزا صاحب کے گھر سے باہر آ گئے۔ چندن نے مرزا کو سلام کیا۔

''سلام مرزا صاحب !''

''سلام، کہو چندن! مٹھائی بھیجی ہے شکھانند جی نے؟''

مٹھائی کا نام سُن کر پاس سے گزرتے میاں رمضانی ٹھٹھک گئے۔

'' جی!''

''ہماری طرف سے شکریہ اور مُبارک باد پہنچا دینا۔''

مرزا غالب نے دونوں کو بخشش دی۔ دونوں چلے گئے۔ اب رمضانی میاں مرزا کے قریب آ گئے۔

'' مرزا ! دیوالی کی مٹھائی کھائیں گے آپ؟''

مرزا مُسکرا دیئے اور پوچھا۔

''برفی ہے۔ آپ کھائیں گے؟''

رمضانی کو اچھا نہیں لگا۔

'' تم مسلمان ہو کر......''

'' برفی ہندو ہے؟''

''اور کیا !''

'' اور جلیبی؟.....وہ کس ذات کی ہے؟ کھتری .... شیعہ؟ یا سُنّی؟''

رمضانی میاں کو جواب پسند نہیں آیا۔ وہ ناراض ہو کر چلا گیا۔ مرزا غالب نے چڑاتے ہوئے ایک شعر کہا۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب!
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

اور گھر کے بھیتر چلے گئے۔

3

مہرولی (دلّی) میں ایک سرائے اور اُس کے پاس امرائی میں۔ غالب اپنی پنشن اور جاگیر کے بارے میں اپنے چچازاد بھائی شمس سے بات چیت کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ شمس نے ہی اُنہیں بُلایا تھا۔ شاید شمس کے من میں کچھ اور تھا اور وہ مرزا کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

'' پنشن کا معاملہ اسد بھائی ہوتے ہوتے ہوگا۔ سارا معاملہ اب فرنگیوں کے ہاتھ میں ہے۔ کمشنر سے ریذیڈنٹ۔ ریذیڈنٹ سے گورنر۔ گورنر سے گورنر جنرل....کوئی بھروسہ نہیں۔ کل کہہ دیں۔ انگلستان جاؤ ملکہ وکٹوریہ کے پاس!''

'' تُم نے تو سُنا ہے۔ انگریزی بھی سیکھ لی ہے، شمس! تم بھی سمجھا نہیں پائے اُنہیں !''

''یس سر، نو سر کہنا سیکھا۔ لیکن یہ فرنگی کمبخت بھی کمال ہیں۔ اچھی خاصی اردو بولنے لگے ہیں۔ فریزر نے باقاعدہ اُستاد رکھ لیے ہیں۔''

'' فریزر کون ہے؟''

''اِس وقت کمشنر ہے دلّی کا۔اور سُنا ہے جلد ہی ریذیڈنٹ بننے والا ہے۔''

'' تُم ملے ہو اُس سے....کیا نام بتایا....تم نے۔''

'' ولیم فریزر .... ہاں ملا ہوں ..... کہتا ہے۔پورا معاملہ شروع سے آخر تک تحریر کر کے دو۔ تا کہ وہ کلکتہ گورنر جنرل کے پاس بھیج سکے.....فیصلہ اُس کے بعد ہی ہو سکے گا۔

سرائے کا نوکر ایک تپائی لا کر رکھ گیا۔دُوسرا نوکر شراب اور پیالے لے کر آ گیا۔شمس نے اپنا گلاس بنایا۔

'' تو معاملہ تحریر کروایا تم نے؟ یا میں تحریر کردوں؟''

''حاجی خان سے کہا تھا کہ وہ کاغذات تیار کر دے۔''

حاجی کا ذکر مرزا کو اچھا نہیں لگا۔کون ہے یہ حاجی جو خود کو جاگیر کا حصہ دار سمجھتا ہے۔

''لیکن حاجی.... حاجی کیوں؟....''

شمس نے اشارے سے چپ رہنے کے لیے کہا اور پھر رازدارانہ انداز میں بیان کیا۔

'' فی الحال کام تو نکل جانے دو۔ساری بھاگ دوڑ وہی کر رہا ہے.....باقی بات بعد میں دیکھ لیں گے۔''

شیطان کا نام لو۔شیطان حاضر۔سرائے سے حاجی خان آتا دِکھائی دیا۔ اُس کے ہاتھ میں کاغذوں کا پُلندہ تھا۔شاید تیسری کُرسی اور تیسرا پیالہ اُسی کے لیے تھا۔غالب حیران۔شمس نے جب ملنے کی بات کی تھی تو حاجی کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔اُنہیں اچھا نہیں لگا....ملی بھگت تھی دونوں کی اِسی لیے مرزا کو بُلایا تھا شمس نے۔ مرزا نے شمس کی طرف دیکھا۔شمس نظریں چُرا رہا تھا۔اِتنے میں حاجی خان اُن کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

'' تسلیم مرزا نوشہ!''

غالب نے آداب کا جواب دیا ہاتھ سے لیکن مُنہ سے کچھ نہیں کہا۔شمس پیالے بھرنے لگا۔ شمس نے ایک اور پانسہ پھینکا۔

'' فریزر نے یقین دلایا ہے کہ ریذیڈنٹ سے کہہ کے کچھ روپے وہ ابھی سرکاری خزانہ سے بھگتان کرا دے گا۔''

شمس نے ایک پیالہ حاجی کو دے دیا اور ایک مرزا کے سامنے رکھا۔ مرزا نے پیالہ دور سرکا دیا۔

'' نہیں ۔میں دن میں نہیں پیتا۔''

شمس نے اِصرار کیا۔حاجی بھی یہی چاہتے تھے۔ مرزا کو لگا اُنہیں شیشے میں اُتارنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

'' اچھی شراب ہے۔ یہیں مہرولی میں چھنتی ہے۔''

مرزا نے انکار کیا۔حاجی نے دیکھا اُن کا وار خالی گیا۔اُس نے بات بدلی۔

'' مرزا نوشہ صرف اِسکاٹ لینڈ کی شراب پیتے ہیں....اولڈ ٹام....میرٹھ چھاونی میں ملتی ہے۔''

'' بہت مہنگی ہوگی؟''

''جی ہاں۔ پورے آٹھ آنے کی بوتل ہے۔''

مرزا نے اِس گفتگو میں کوئی شرکت نہیں کی۔وہ صاف صاف بات کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ خود صاف گو تھے۔شمس اور حاجی سیاست کر رہے تھے۔ مرزا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''روپیے کب تک مِل جائیں گے۔''

'' چار پانچ روز میں۔انشااللہ عید سے پہلے ہی مل جائیں گے.....لیکن..... اس درخواست پر تمہارے دستخط ضروری ہیں اُس کے بغیر ..... شاید''

حاجی نے کاغذات مرزا کے سامنے رکھ دیئے۔ مرزا نے کاغذات پر نظر ڈالی لیکن پڑھنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ اُنہوں نے پوچھا۔

'' دستخط کہاں کرنے ہیں؟''

حاجی نے درخواست کا آخری پنّا دکھایا۔قلم دوات کا پہلے سے ہی اِنتظام کیا گیا تھا۔مرزا نے دستخط کر دیے۔ حاجی اور شمس خوش تھے۔ وہ ایک شریف آدمی کو گھیرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔مرزا اُٹھے۔نہ دونوں کی طرف دیکھا نہ آداب ہی کیا۔سیدھے پاس ہی چھاؤں میں گھوڑے کی طرف گئے۔گھوڑا کھولا،گھوڑے پر بیٹھے اور چل دیے۔

4

مرزا کا مکان اور مکان میں امراؤ بیگم کی خواب گاہ! بیگم پلنگ پر لیٹی ہوئی تھیں اور مرزا اُن کی پیٹھ پر گاؤ تکیئے لگا رہے تھے۔ مرزا کا پورا دھیان بیگم کی طرف تھا۔ خاص کر جب سے وہ اُمید سے تھیں۔ لیکن بیگم شمس اور حاجی کو لے کر بہت بگڑی ہوئی تھیں۔ اور اُنہوں نے اپنا سارا غصہ مرزا پر اُتارا۔

"شاعری کر لینے سے آدمی سمجھدار نہیں ہو جاتا۔ ..... کُچھ دُنیا کے تیور بھی سمجھتے ہیں آپ؟"

غالب نے مُسکرا کر جواب دیا۔

"تو بتایئے! میں کیا کرتا۔ کاغذات آپ کے پاس لے کر آتا؟"

"کیوں؟ وہ آپ کے وکیل ہیں نہ...... ہیرا لال..... وہ کس مرض کی دوا ہیں؟..... دوٹوک کہہ دیتے کہ اُنہیں دکھا لوں تو دستخط کر دُوں گا۔"

مرزا اُن کی بغل میں آ کر بیٹھ گئے۔

"اب اِتنے بَل نہ ڈالو پیشانی پر بیگم! ہونے والے کے ماتھے پر بھی سلوٹیں آ جائیں گی۔"

"آپ بھی تو ہمیں پریشان کیے بغیر نہیں رہتے۔"

"آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔"

اِتنے میں دروازے پر دستک سُنائی دی۔ مرزا نے اُنہیں منانے کی کوشش کی۔

"اچھا بیگم! پیر کے روز جاؤں گا مہرولی! روپے طلب کروں گا۔ نہ دیے تو کاغذات واپس لے لُوں گا۔"

امراؤ بیگم مرزا کی چکنی چپڑی باتوں میں نہیں آئیں۔ اور بگڑ گئیں۔

"ہاں!.... جیسے دے ہی دیں گے۔ ہاتھ لگی بٹیر کوئی لوٹاتا ہے۔"

مرزا نے اپنے دل کی بات کہی۔ صاف ..... دوٹوک۔

"اُن کا ایمان وہ جانیں۔ میں اپنا ایمان خراب کیوں کروں؟ وہ بھی ایک بٹیر چور کے پیچھے....."

وفادار داخل ہوئی۔ دستک بھی اُسی نے دی تھی۔ وفادار جانتی تھی کہ ایسے موقعہ پر بالکل اندر آنا نہیں

چاہیے لیکن مجبور تھی۔

''بی بی جی! دائی بی آئی ہیں مالش کے لیے۔''

''ہاں بُلا لو۔''

مرزا کھڑے ہو گئے۔

'' ہم چلتے ہیں۔ کس روز کی اُمید ہے؟''

امراؤ لجائی۔

''انشااللہ۔ عید کے روز۔''

'' پھر تو عید دوبالا ہو جائے گی۔''

آنگن سے گذرتے ہُوئے اُن کی نظر پنجرے میں بند طوطے پر پڑی۔ گردن جُھکائے پڑا تھا۔ مرزا نے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

''ارے میاں مٹھو! آپ کے نہ جُورو نہ بچے۔''

آپ کیوں سر جھکائے بیٹھے ہیں؟

5

مہرولی کی سرائے، وہی امرائی۔ شمس اور حاجی مرزا غالب کے سامنے کھڑے تھے۔ تپائی پر پیسوں کی دو تھیلیاں۔ غالب کے منہ میں حُقّے کی نے۔ شمس نے تھیلیاں اُن کی طرف بڑھا دیں۔

''یہ لو اسد بھائی۔ ساڑھے سات سو ہیں۔ چار سو اِس میں۔ ساڑھے تین سو اِس میں۔''

غالب نے دونوں تھیلیاں اُٹھا لیں۔

''اور تم میاں حاجی! کب لوٹ رہے ہو آگرہ؟''

''کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔''

'' تم ہمارا ایک کام کر دینا۔ یہ ساڑے تین سو روپئے یوسف بھائی کو دے دینا۔ یوسف مرزا کو جانتے ہو نہ۔ اور کہنا خط لکھے۔''

اور پھر وہ شمس سے مخاطب ہوئے۔

''اور شمس، تمہاری سواری لئے جاتا ہوں۔ میرٹھ جانا ہے۔ وہاں سے واپس آنے پر بھجوا دوں گا۔''

شمس انکار نہ کر پایا۔

''لے جاؤ...... میرٹھ میں کیا کام ہے؟''

مرزا ذرا مُسکرائے لیکن کُچھ کہا نہیں۔ بس خُدا حافظ کہہ کر چل دیئے۔ حاجی نے شمس کی بات کا جواب دیا۔

''میرٹھ چھاؤنی میں انگریزی شراب ملتی ہے حُضور! پیسے ہاتھ آئے ہیں تو اور کہاں جائیں گے مرزا نوشہ؟''

'' تو باقی روپیوں کی شراب خرید لیں گے کیا؟''

''کتنی خریدتے ہیں یہ تو وہی جانیں۔''

6

گھر کے سامنے پہنچ کر مرزا نے گدھے والے کو رُکنے کے لیے کہا۔

''تم یہیں ٹھہرو! مُلازم کو بھیجتا ہوں۔ اور ہاں سنبھال کر اُتارنا۔ کانچ کا سامان ہے پیٹیوں میں۔''

مرزا گھر میں داخل ہوئے۔ آنگن میں آ کر مرزا نے کلو میاں کو آواز دی۔

'' کلو میاں!''

کلو میاں شاید کہیں اور کام میں مصروف تھا۔ وفادار حاضر ہو گئی۔

'' فلمایئے حضُول۔ (فرمایئے حضور)!''

'' کلو میاں کہاں ہیں۔ اُن سے کہو باہر کُچھ پیٹیاں لدی ہیں گدھے پر! اُتروا لیں!''

''کیا لائیں ہیں حُضول (حضور) والا؟''

'' آپ کے کام کی چیز نہیں ہے وفادار۔''

اتنے میں کلو میاں حاضر ہو گیا۔ مرزا نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

'' سُنو کلو میاں! باہر پیٹیوں میں شراب کی بوتلیں ہیں اُتروا لو! اور ذرا احتیاط سے اُٹھوا کے اُوپر کمرے میں

پہنچا دینا۔

''جی حضور!''

کلو سامان اُتروانے چلا گیا۔ مرزا نے وفادار سے پوچھا۔

''بیگم اکیلی ہیں اندر؟ جا سکتا ہوں کمرے میں؟''

''ضرور تشریف لے جایئے۔ صبح سے کئی بار پُوچھ چکی ہیں۔ آپ مہرولی سے لوٹے کہ نہیں۔''

مرزا بیگم کے کمرے میں داخل ہوئے۔ امراؤ لیٹی ہوئی تھیں پلنگ پر اُٹھ بیٹھیں۔

'' بڑی دیر کر دی لوٹنے میں؟ کہاں رہ گئے تھے۔''

مرزا کے چہرے پہ مُسکان بکھری! وہ پاس پلنگ پر بیٹھ گئے۔

'' یوں ہی ذرا میرٹھ چھاؤنی کو پھیرا لگانے چلا گیا تھا۔''

'' روپے دیے کس نے؟''

''ہاں۔ ساڑھے سات سو دیئے۔ آدھے یوسف مرزا کو بھجوا دیئے... حاجی کے ہاتھ۔''

امراؤ بیگم نے ماتھا پیٹا۔ مرزا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب وہ کہاں چُوکے۔

'' اب کون سی غلطی کی ہم نے؟''

امراؤ دبی آواز میں چیخ پڑیں۔

''حاجی کیا پہنچائے گا یوسف تک؟''

مرزا اس بات کا کیا جواب دیتے اب ہر ایک بات پر شک کرے آدمی تو جیئے گا کیسے۔ وہ آگے آئے اور پیٹ کو چھو لیا۔ اُنہوں نے بیگم سے کہا۔

'' آہستہ بولیے!''

امراؤ بیگم نے اُن کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں۔ کیوں؟

'' یہ آنے والا سُن لے گا۔ سمجھے گا آپ بہت سخت مزاج کی امّی ہیں۔''

لیکن امراؤ بیگم کے مزاج میں کوئی نرمی نہیں آئی۔ وہ ابھی بھی غصے میں تھیں۔

'' آپ بھی حد کرتے ہیں۔ حاجی پر کیسے اعتبار کر لیا آپ نے؟''

''بھئی! جب پیسے دینے میں خیانت نہیں کی تو پہنچانے میں کیوں کرے گا؟''

اس بات کا جواب امراؤ بیگم کے پاس نہ تھا لیکن تفتیش ابھی جاری تھی۔ اُنہوں نے دُوسرا سوال کیا۔

'' اور باقی روپیوں کا کیا کیا؟''

مرزا کھڑے ہوگئے۔ مُجرم کی طرح۔ صفائی دینے کے لیے۔

"بنئے کا پچھلا اُدھار چُکتا کر آیا۔"

تیسرا سوال۔

" اور بزاز؟"

" وہ بھی چُکتا کر دیا۔"

چوتھا سوال۔ یہ ٹال والے کے بارے میں تھا جہاں سے ایندھن، کوئلہ آتا تھا۔

"اور ٹال کا؟"

" ٹال دیا۔"

چوتھے جواب میں غالب نے حقیقت بیان کی۔ لیکن امراؤ پسیجنے والی نہیں تھیں۔

"دے دیا بھئی سب دے دیا۔"

"اور باقی؟....."

مرزا کو سچ بولنا پڑا۔

" باقی کی شراب لے آیا۔"

تفتیش ابھی جاری تھی۔

" وہ کیوں؟"

"پیدا کرنے والے نے رزق کا وعدہ کیا ہے۔ کھانے کو وہ دے گا..... پینے کا وعدہ نہیں کیا۔ سو میں خود ہی لے آیا۔"

ایک لمبی سانس لے کر امراؤ خاموش رہ گئیں۔ مرزا اس ٹھنڈی سانس سے واقف تھے۔ اس کی شدّت جانتے تھے۔ اب اُنہوں نے جو وجہ بتائی وہ صاف اور سچ تھی۔

"دیکھو بیگم!.....دوست یار دعوت مانگ رہے ہیں.....وعدہ کیا ہے اس بار دوہری عید مناؤں گا ......بتاؤ اب دعوت میں شراب نہ ہوئی تو کوئی کیوں آنے لگا ہمارے یہاں! خُدا لگتی کہو ..... آنے والے کا اِستقبال نہیں کروگی؟"

امراؤ خفا تو نہ ہوئیں۔ لیکن ماتھے پر فکر کی ایک شکن اُبھر آئی۔

" کُچھ پیسے ہاتھ میں رہتے عید پر۔ تو کیا بُرا تھا؟"

"اور آجائیں گے بیگم ....عید سے ایک روز پہلے ہی لالہ بنسی دھر آنے والے ہیں۔ میرا دیوان لے کر گئے ہیں لکھنؤ۔ کُچھ تو بیانہ لے کر آئیں گے۔"

امراؤ نے مرزا کی طرف دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں!

7

دیوان کا مسودہ میز پر پڑا تھا۔ بنسی دھر نے خط نہیں لکھا۔ خود بتانے دِلّی چلے آئے۔ غالب نے پوچھا۔

"نول کشور والوں نے بھی نہیں چھاپا۔"

بنسی دھر نے سر ہلا کر انکار کیا۔

"......کوئی بھی چھاپنے کو تیار نہ ہوا؟.... میں نے بہت کوشش کی اسد......"

مرزا نے آہ بھری۔

اور دھیرے دھیرے منڈیر تک آئے۔ کوئی صحن میں داخل ہوا۔ یہ دائی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں گرم پانی کا برتن تھا۔ اُس کے بعد صحن میں ہل چل مچی۔ وفادار پھٹے پُرانے کپڑے لے کر آئی اور اندر چلی گئی۔

کلّو میاں لوبان جلانے لگے اور وفادار لوبان لے کر پھر اندر چلی گئی۔ اب صحن میں دُھواں ہی دُھواں تھا۔

مرزا پھر بنسی دھر کے پاس آ گئے اور ایک شعر کہا۔

زندگی اپنی جب اِس شکل میں گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خُدا رکھتے تھے

مرزا ابھی بیٹھے ہی تھے کہ نیچے سے ایک چیخ سُنائی دی۔ وہ مُسکرائے۔ لیکن پھر نیچے سے پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آوازیں آئیں۔ مرزا کے چہرے پر فکر اور غم کی لکیریں اُبھر آئیں۔ بنسی دھر بھی کھڑے ہو گئے غالب دوڑتے ہوئے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئے صحن پار کیا۔ اندر سے دائی روتے ہوئے باہر نکلی۔ غالب نے بے دم ہو کر پوچھا۔

"دائی بی! کیا بات ہے؟"

"اللہ کے فضل سے امراؤ ٹھیک ہیں!"

دائی بی دیوار کی طرف مُنہ کر کے رو رہی تھی۔ مرزا دھیرے دھیرے اُس کے سامنے آ کر کھڑے

ہو گئے۔ ایک ستون کو پکڑے وفادار سسک رہی تھی کلو برآمدے میں بُت بنا کھڑا تھا۔ غالب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُنہوں نے دائی سے پوچھا۔

" اور بچہ؟"

" بچہ ..... مُردہ پیدا ہوا ......"

مرزا اندر جانا چاہ رہے تھے لیکن دائی نے کواڑ بند کر دیا۔ مرزا غالب سکتے میں آ گئے اور دبی آواز میں پڑھا۔

" اِنَّالِلّٰه وَ اِنَّا الَیهِ رَاجِعُونَ."

بنسی دھر بھی صحن میں آ گئے تھے اور اُنہیں ان دیکھا کر مرزا واپس سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گئے۔

ہوا کے جھونکے نے دیوان کے مسودہ کو بکھرا دیا تھا۔ کتابت کے پنے گلی میں جانے کہاں کہاں اُڑ گئے۔ واحد ایک پنہ بچا تھا جو ابھی تک جلد سے جُڑا ہوا تھا۔ مرزا نے وہ پنا اُٹھالیا اُسے غور سے دیکھا۔ غزل تھی۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

مرزا نے ہاتھ میں بچا دیوان کا آخری پنا بھی ہوا میں اُڑا دیا۔ باقی اشعار ذہن میں گونجتے رہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے، پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں!

پانچ

1

دلّی کا ایک چنڈوخانہ۔ ہر جگہ دھواں بھرا ہوا تھا۔ اُس دُھوئیں میں کچھ چراغ۔ کچھ شمعیں کچھ شعلے۔ کہیں کہیں کسی نشہ باز کا چہرہ مہرہ دکھائی دیتا تھا۔ ان میں سے ایک نشہ خور نے دوسرے سے کہا۔

''فدّن!''

فِدّن میاں بھی نشہ میں تھا۔

''ہاں خورشید!''

''ارے میاں۔ بڑے عرصہ کے بعد جھانکا چنڈوخانہ میں...کہاں رہے؟.....پچھلی بار عید کے مشاعرے میں بھی نظر نہیں آئے؟''

فِدّن اب پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''کچھ مصروفیت تھی..... سُنا ہے خوب رہا عید کا مشاعرہ .....سُنا ہے اُستاد ذوق نے مُشاعرہ ہی لوٹ لیا۔''

''اور کیا؟ یوں ہی بادشاہ (بادشاہ) کے اُستاد نہیں ہوئے۔ کیا غزل پڑھی تھی۔''

اب تو گھبرا کے یہ کہتے کہ مرجائیں گے
مرگئے پر نہ لگا جی، تو کِدھر جائیں گے

پاس ہی ایک اور شخص تھا جو بنیئے کی دُکان میں وفادار کو ملا تھا۔ اُس نے خورشید میاں سے پوچھا۔

''اماں! وہ نظر نہیں آئے۔ وہ آگرے والے؟''

''مِرزا غالب ؟''

''ہاں وہی !''

''اجی! وہ کافر کیوں آنے لگا عید کے مشاعرے میں۔ وہ بھی میر کا بھائی ہے....اُسی طرح نِکالا جائے گا۔''

'' مطلب ؟''

فدن نے ٹکڑا لگایا۔

'' کیوں میر کا شعر نہیں سُنا۔''

میر کے دین و مذہب کو اب پُوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا ، دیر میں بیٹھا ، کب کا ترک اِسلام کیا

'' بڑی ہی بے دینی باتیں کرتا تھا۔''

'' اجی ہم نے سنا ہے، دیوالی بڑے زوروں سے منائی مرزا نے۔ اور عید پر کُچھ بھی نہیں ... گھر میں ماتم بچھا ہوُا تھا۔''

فِدّن میاں نے کان پکڑے۔

'' توبہ ۔ توبہ۔ دین، ایمان کا تو نام ہی اُٹھتا جا رہا ہے دُنیا سے۔.... لا چھینو ! دے چلم ایک، خُدا کے نام پہ..... لعنت پڑے ایسے کافروں پہ... کہاں کہاں سے آ کے دلّی میں بس جاتے ہیں۔''

2

میز پر کئی چھٹیاں بکھری پڑی تھیں کُچھ خط لفافوں میں بند قرینے سے رکھے تھے۔ موم بتی جل رہی تھی۔ آدھی جل چکی تھی یا یوں کہیے آدھی موجود تھی۔ شب و روز مونتاژ کی صُورت گذر رہے تھے۔

مرزا اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔ گلی سے چوکیدار کی آواز آئی۔

'' جاگتے رہو!''

دل کے ولولے مرزا کی زبان پہ آ گئے۔

سب کہاں ، کُچھ لالہ و گُل میں نُمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

مرزا اپنے بیٹے کے لیے فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ اُسی تخیل میں تھے۔ واپس حال میں پہنچے تو پاس ہی ایک بوتل رکھی ہوئی تھی۔ بچی ہوئی شراب ایک گلاس میں انڈیل لی۔

رنج سے خوگر ہؤا اِنساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مُشکلیں مجھ پر پڑیں اِتنی کہ آساں ہوگئیں

مرزا نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں پی گئے۔

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

3

کلو میاں نے مرزا صاحب کے لیے صُبح کا ناشتہ تیار کیا۔ امراؤ بیگم بھی رسوئی میں تھیں اور کئی دیگوں اور پتیلیوں سے کباب اور دیگر پکوان نکال کر طشتریوں میں سجا لئے۔ اتنے میں باہر سے آواز آئی جسے امراؤ بیگم پہچانتی تھیں۔

''مائی!''

''آج سہہ شنبہ ہے؟ منگل وار؟'' امراؤ نے وفادار سے پوچھا۔

''جی بی بی جی!''

''یہ برہمن ہر منگل کو آتا ہے۔ جا تو آٹا دے کے آجا۔''

وفادار ایک کٹورا آٹا لے کر باہر جانے لگی۔ پھر سُورداس نے صدا دی۔

''مائی ...''

''آرہی (آرہی) ہوں ٹھہلو (ٹھہرو)!''

کلو ایک تھال میں طشتریاں، کٹورے لے کر گیا مرزا صاحب کے کمرے کی طرف۔ اوپر جا کر دیکھا کہ

دروازہ پوری طرح سے کھلا ہوا نہیں ہے۔ کلو میاں نے آواز دی۔

''حاضر ہو سکتا ہوں حضور!''

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ کلو نے اندر جھانکا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ چھت پر دیکھا اُس نے وہیں سے امراؤ بیگم کو آواز دی۔

''بی بی صاحبہ! حضور تو نہیں ہیں کمرے میں۔''

امراؤ بیگم باہر برآمدے میں آ گئیں۔ سمجھ گئیں کہ باہر چلے گئے۔

''اللہ! پھر بغیر کھائے پیے نکل گئے کہیں!''

کلو نیچے آ گیا۔

''کچھ عرصہ سے بہت پریشان نظر آتے ہیں آقا!''

''جب سے بچے کا انتقال ہوا ہے، الگ الگ رہنے لگے ہیں مجھ سے۔ اللہ جانے مجھ سے کیوں خفا ہیں؟''

کلو نے حوصلہ دیا۔

''لو ! آپ سے کیوں خفا ہونے لگے؟ پریشان ہیں اِس لیے صبح سے حاجی میر کی دُکان پر جا بیٹھتے ہیں۔ وہیں کتابوں میں سر ڈبو کے دن کاٹ دیتے ہیں۔''

4

دلّی میں حاجی میر کی دُکان کافی مشہور تھی۔ اُردو فارسی اور عربی کی کتابیں بکتی تھیں۔ ایسے کتب خانوں میں پرانے دیوان مثنویاں، کُلیات اور دیگر مجموعے بہت ملتے تھے۔ دُکان کے پچھلے حصے میں ایک تخت پوش پہ بیٹھے مرزا غالب ایسی ہی کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ اُن کی نظریں کتاب پر ضرور تھی لیکن وہ خُود کہیں اور ہی تھے۔ حاجی میر صاحب اُن کے پاس آئے اور پوچھا۔

''کچھ روز سے مایوس نظر آتے ہو نوشہ میاں۔ کیا ہوا؟''

مرزا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''حوصلہ رکھیے کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔''

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

مرزا نے آنکھیں ملیں۔ وہ رات بھر نہیں سوئے تھے۔

''لگتا ہے رات سوئے نہیں!''

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

حاجی میر مُسکرا دیئے۔

''تازہ کلام ہے؟ ایک کاغذ پہ لکھ دو۔ میں سنبھال لُوں گا۔ کتنا کلام تم نے ایسے ہی ضائع کر دیا۔''

حاجی میر نے مرزا کی طرف کاغذ بڑھایا۔ مرزا نے تازہ کلام لکھ دیا۔ لکھتے لکھتے کہہ بیٹھے۔

''میر صاحب! سوچتا ہوں لکھنؤ چلا جاؤں۔ شاید نواب نصیرالدین حیدر کے دربار میں جگہ مل جائے۔''

'' اِس مغالطے میں نہ رہو مرزا۔ دلّی لکھنؤ کا تو اینٹ روڑے کا بیر ہے۔ دلّی والوں کو تو لکھنؤ والے شعر نہیں پڑھنے دیتے اپنے شہر میں۔''

'' میں تو دلّی والا بھی نہیں۔''

'' یہ دُرست ہے کہ تم آگرہ کے ہو لیکن........''

'' آگرے کا بھی نہیں میر صاحب! میں تو اُس چمن کا بُلبل ہوں جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔''

ہُوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گُلشنِ ناآفریدہ ہوں

حاجی میر نے اشعار والا کاغذ اٹھا لیا۔

'' کیا وہ چمن بھی پیدا ہوگا کبھی؟''

''ہاں میر صاحب !..... دلّی، لکھنؤ، آگرہ، الہ آباد، حیدرآباد۔ ان سب کی کوکھ سے اگر کبھی ایک ہندوستان پیدا ہوا تو اس چمن کی کسی ایک شاخ پر مجھے بھی آشیانے کی جگہ مل جائے گی۔ میں اُردو کا شاعر ہوں میر صاحب، کسی ایک شہر کا نہیں...... اور اُردو، اِس مُلک کی زبان ہے۔ یہاں کے عوام کی زبان ہے۔ قلعے کی، یا نوابوں کی، شاہوں کی نہیں۔''

حاجی میر صاحب سُنتے رہے اور حیرت سے دیکھتے رہے۔ یہ شخص کیا ہے؟ کون ہے؟ ادب پہ، زندگی پہ

گفتگو کرتا ہے۔ وقت اور حالات پر نکتہ چینی کرتا ہے۔

سچ مچ ہم اُنہیں کہاں جانتے ہیں۔ وقت اور زمانہ اُنہیں کو کہاں پہچانتا ہے۔........ اپنی جوتی چٹخاتے مرزا غالب کہیں نکل رہے تھے۔ دُکان سے باہر آتے ہی ایک آواز نے اُنہیں جھنجھنا دیا۔ ایک مصرع اُن کے کانوں سے ٹکرایا۔

''دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں''

مرزا نے پہچانا۔ اُن کا ہی کلام تھا۔ حاجی میر اُن کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

'' کہاں کھو گئے مرزا؟ یہ شعر آپ ہی کا ہے۔''

''وہی سُن رہا ہوں ....اپنا شعر، دلّی میں .... پہلی بار .... کسی اور کی زبان سے۔''

پھر دوسرا مصرع سُنائی دیا۔ حاجی میر نے مکان کے اُوپر کوٹھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

'' لیکن غزل آپ کی بالا خانے تک کیسے پہنچی؟''

''وہی سوچ رہا ہوں..... زمین کی چیز آسماں کی طرف کس نے اُڑا دی۔''

غزل چلتی رہی۔ مرزا دُکان سے اُتر کے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔

5

دیر نہیں ، حرم نہیں ، در نہیں ، آستاں نہیں

بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم ......

غزل رُک گئی....

کوٹھے کے ادھ کھلے دروازے پر چلمن پڑی تھی۔ چِک اٹھانے کی ضرورت ہی نہ پڑی مرزا غالب نے دیکھا ایک خوبصورت جوان لڑکی اُن کی غزل گا رہی تھی۔ لڑکی کو لگا کہ دروازے پر کوئی آدمی ہے۔ اُس نے وہیں سے آواز دی۔

''کون؟ کہیے کون ہیں آپ؟''

مرزا ہچکچائے۔

''معاف کیجئے گا محترمہ ..... یہ غزل سُن کے چلا آیا۔''

نواب جان دروازے تک آئی لیکن چلمن کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔

'' کِس کی غزل ہے، جانتے ہیں؟''

'' ہاں ایک دوست ہیں میرے مرزا غالب! اُنہیں کے اشعار ہیں.....لیکن آپ کو کہاں ملے؟''

نواب جان ہنسی۔ اُس میں جاندار کھنک تھی۔

''کسی نے چورن لپیٹ کے دِیا تھا اِس پرزہ میں۔ مقطع نہیں ہے۔ ایک شعر مِٹ گیا۔ ایک پھٹ گیا.....آگے کا شعر بھی ادھورا ہے۔''

نواب جان نے پرزہ نِکالا اور مرزا کو دِکھایا۔ دیوان کا یہ وہی پتا تھا جو غالب کے گھر سے گلی میں اُڑ گیا تھا۔

غالب نے پورا شعر کہہ سُنایا۔

ہاں وہ نہیں خُدا پرست، جاؤ وہ بیوفا سہی
جس کو ہو دین و دِل عزیز۔ اُس کی گلی میں جائے کیوں

نواب جان نے شعر دہرایا۔ مرزا دیکھتے رہے۔ پھر اپنی بیاض میں درج کرنے کے لیے۔ نواب جان کاغذ قلم لے کر آ گئی۔

''اِجازت ہو تو درج کر لوں؟''

غالب نے شعر دہرایا۔

ہاں وہ نہیں خُدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دِل عزیز۔ اُس کی گلی میں جائے کیوں

نواب جان کے مُنہ سے بے ساختہ 'واہ' نکلی۔ مُنہ سے بھی، دِل سے بھی اور رُوح سے بھی۔

''ہائے اللہ ۔ واہ !''

غالب نے مقطع کہا۔

''غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں ''

نواب جان نے دہرایا اپنی کھنک دار آواز میں۔

'' غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں ''

غالب نے شعر مکمل کیا۔

" رویئے زار زار کیا ، کیجیے ہائے ہائے کیوں "

اب غالب رُکے نہیں سیڑھیاں اُترنے لگے۔نواب جان بھاگی بھاگی کمرے سے باہر آ گئی۔اُس نے سیڑھیوں سے ہی آواز دی۔غالب آدھی سیڑھیاں اُتر چکے تھے۔صدا سُنی۔نواب جان نے سوال کیا۔

"سنیے.... کون ہیں غالب؟"

غالب پھر سیڑھیاں اُترنے لگے۔سوال کا جواب دیا دبی آواز میں۔

پُوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہیں
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

6

مرزا غالب لوٹ کر دُکان میں داخل ہوئے۔میر صاحب نے پُوچھا۔

" مُلاقات ہوئی؟..."

" میر صاحب! جو شعر گلیوں میں فقیر گائے اور بالا خانے پر طوائفیں.....اُس شعر کو کون مار سکتا ہے؟"

اِس دوران اُوپر کے کوٹھے سے آلاپ سُنائی دی۔ دونوں نے کوٹھے کی جانب دیکھا۔

7

شاید اُسی دِن کی بات ہے یا اگلے روز کی،نواب جان ایک کورے کاغذ پر غالب کی غزل لکھ رہی تھی اور گُنگنا رہی تھی۔گلریز نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اُن کی سیڑھیوں پر ایک پٹھان بیٹھا ہوُا تھا۔جیم شیم .....گلریز

بھاگی بھاگی نواب جان کے پاس آئی۔

''باجی۔ باجی !''

لیکن باجی کا دھیان غزل پر تھا۔

'' باجی! وہ پٹھان پھر آ کر سیڑھیوں پر بیٹھا ہے۔''

'' چھوڑو۔کتنی بار منع کیا۔ کیا کریں۔ بیٹھا رہنے دو۔''

گلریز کو نواب جان باجی کی یہی بات اچھی نہیں لگتی۔اُدھر بیچارا پٹھان کب سے سیڑھیوں پر بیٹھا ہے،ادھر باجی کب سے مرزا غالب کی غزل لکھے جا رہی ہے۔

''پھر وہی غالب کی غزل۔صبح سے دس بار تو لکھ چکی ہیں !''

لیکن نواب جان کو چین کہاں! اُس نے پوری کی پوری غزل گائی۔

دِل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت ، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار ، کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں ، در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم ، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

ہاں وہ نہیں خُدا پرست ، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دِل عزیز ، اُس کی گلی میں جائے کیوں

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا ، کیجیے ہائے ہائے کیوں

چھ

1

مسجد کے پاس والے تکو پر مُرغوں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ کھلاڑی اپنے اپنے مُرغوں کو اُکسا رہے تھے۔

''چل آجا باشا۔ آجا''

''کلغی اُٹھا کے دِکھا دے۔ بیٹا! آجا ...آ''

تماشائیوں کی بھیڑ تھی۔ شور شرابہ تھا۔ کھیلنے والے شرطیں لگا رہے تھے۔ تبھی گھوڑے پہ سوار کوتوال آن پہنچا۔ اُس کے ساتھ دو سپاہی تھے۔ وہ ایک مُجرم کو رسیوں سے باندھے ہوئے لے جا رہے تھے۔ پھر شور مچا۔

'' ارے بھاگو! کوتوال آ رہا ہے۔''

تماشائی بھاگ کھڑے ہوئے۔ کچھ مسجد کی جانب بھاگے۔ کئی بازار کی طرف اور دُکانوں میں داخل ہو گئے۔

جب کوتوال وہاں پہنچا۔ وہاں صرف دو مُرغے تھے۔ تھکے ہارے۔ ہانپتے ہُوئے۔ ان کو جوش دِلانے والے بھاگ چکے تھے۔

''کس کے مرغے ہیں یہ؟'' کوتوال نے پوچھا۔

کہیں غیب سے ایک آواز آئی۔

'' مُرغی کے .....''

کوئی ہنس پڑا۔ لیکن دبی آواز میں۔ کوتوال نے چاروں طرف نظر پھیری اور پھر سوال کیا۔

'' میں پوچھتا ہُوں یہ مُرغے کس کے ہیں؟ کون جُوا کھیل رہا تھا یہاں؟''

پاس کی دُکان کے بزاز نے مُرغوں کی طرف اِشارہ کیا۔

''یہی دونوں لڑ رہے ہیں کوتوال صاحب۔ اِنہیں کو لے جائیے پکڑ کے۔''

بہت طرف سے قہقہوں کی آواز گونجی۔ کوتوال نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

''دِلّی سے جُوئے کی یہ وبا نہ نکالی تو میرا نام مُنیر خان نہیں۔''

اس بیچ صادق نے اعتراض کیا۔

"رشید علی کو کیوں پکڑ رکھا ہے کوتوال صاحب؟ اِس نے کیا کِیا ہے؟"

"وہی کیا ہے جو اُس دِن آپ کر رہے تھے۔ کِسی دِن گھر میں گھُس کر دھر لُوں گا۔ یاد رکھنا۔..... بڑا مذاق کر رہے تھے آپ کے وہ شاعر۔ آگاہ کر دینا اُنہیں۔"

2

مرزا غالب اپنی بیٹھک میں آنکھیں مُوندے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ پیچھے امراؤ کا دُوپٹا لٹک رہا تھا۔ وہ گنگنا رہے تھے اور دُوپٹے میں گرہیں لگا رہے تھے۔ امراؤ اندر داخل ہوئیں وہ دبے پاؤں آ کر دُوپٹہ اُٹھا لینا چاہتی تھیں کہ مرزا نے آنکھیں کھولیں۔

"ارے جاگ رہے ہیں آپ؟ یہ میرے دُوپٹے میں کیوں گرہیں لگا رہے ہیں؟"

"غزل ہی تو ہے۔ یہاں باندھتا ہوں۔ گرہ کہیں اور لگتی ہے۔"

"کون ہے؟...... دل میں گرہ پڑ گئی ہے کہیں؟"

غالب بس مُسکرا کر رہ گئے اور سر ہلا کر 'ہاں' کہا۔ امراؤ کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"کوئی اور ہے تو لے آئیے۔"

"ایک پاؤں کی بیڑی نے ہی مُشکل میں ڈال رکھا ہے۔ دوسری بھی پہن لی، تو چلنے سے ناچار ہو جاؤں گا۔"

امراؤ پاس ہی بیٹھ گئیں۔

"کچھ عرصہ سے دیکھ رہی ہوں، بہت دور دور رہتے ہیں آپ؟ پھر کون ہے، جو ہمیں اِس طرح کھینچ کے الگ کیے دیتا ہے۔"

"بیگم تُم تو جانتی ہو۔ صبح سے شام تک کِس دوڑ دُھوپ میں رہتا ہوں۔"

سَو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

"لوگ باگ تو بے فکرا کہتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں، جُوا کھیلتے ہیں مرزا۔ کیا مُشکل ہے انہیں؟"

" لوگ کیا جانیں! میں کیوں پیتا ہوں، کیوں جُوا کھیلتا ہوں! اگر وہ بھی نہ کروں تو گھُٹ کر مر جاؤں بیگم۔ غم میں ہنس لیتا ہوں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ رونا ہی نہیں آتا۔"

امراؤ نے چھیڑ دیا۔

" ہم نے تو کبھی روتے نہیں دیکھا آپ کو؟"

غالب مُسکرا دیے۔

"ہاں ......"

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اُسی وقت آذان سُنائی دی۔ امراؤ بیگم نے جانماز اُٹھائی۔

" اللہ! نماز کا وقت ہو گیا۔"

مرزا نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آپ پُوچھ رہیں تھیں نہ، کہ وہ کون ہے جو ہمیں کھینچ کے الگ کیے دیتا ہے..... اب سُن لیا؟"

امراؤ نے کان پکڑ کر توبہ کی۔

" توبہ توبہ ! کیسی کُفر کی باتیں کرتے ہیں؟"

غالب مُسکرا دیے۔

"اچھا بیگم! پانچوں وقت نمازیں پڑھتی ہو۔ اتنی کیا باتیں ہوتی ہیں اللہ میاں سے؟"

"آپ سُن کے کیا کریں گے؟ نہ روزہ کے، نہ نماز کے۔"

" تو ٹھیک ہے۔ لیکن قیامت کے دِن میری شان دیکھنا۔ تم اُن نیلے تہمد والوں کے ساتھ ہوگی۔ ایک ہاتھ میں ٹوٹی دار بدھنی ہوگی اور ایک ہاتھ میں تسبیح .....اور میں فرعون۔ نمرُود اور اُن شہنشاہوں کی ٹولی میں جو گناہ گار سہی لیکن ......"

امراؤ نے کان پکڑ کے پھر توبہ کی۔

" توبہ توبہ۔ رحمٰن رحم کر انہیں معاف کرنا۔"

اور قرآن کی ایک آیت پڑھی۔ امراؤ نماز پڑھنے گئیں۔ اِتنے میں کلو میاں نے آکر خبر دی۔

'' حضورِ اعلیٰ۔ کوئی صاحب ملنے آئے ہیں۔''

''کون ہیں۔''

'' پہلے کبھی دیکھا نہیں۔''

'' میں آتا ہوں۔''

کلّو کے پیچھے پیچھے مرزا بھی چل دیئے وہ برآمدہ پار کرنا چاہتے تھے لیکن دیکھا کہ امراؤ سجدہ میں ہیں۔ مرزا غالب نے اپنی موجڑی اُٹھائی۔ اور بُدبُداتے ہوئے کہا۔

'' لیجیے۔ سارے صحن کو مسجد بنادیا ہے۔ اب یہ جوتے کہاں پہ رکھوں؟ اور پہن کر کہاں سے گزروں؟''

موجڑی اُٹھائے، بچتے بچاتے اُنہوں نے برآمدہ پار کیا اور صحن میں آ گئے۔

3

میاں فدّن گھر کے باہر کھڑے تھے، کلّو میاں نے آکر خبر دی۔

'' حضور تھوڑا انتظار کریں۔ آقا ابھی تشریف لاتے ہیں۔''

اِتنے میں مرزا باہر آ گئے۔ فدّن نے سلام کیا۔

''سلام عرض کرتا ہوں حضور!''

مرزا نے پہچاننے کی کوشش کی لیکن کچھ یاد نہیں آیا۔

''غالب آپ کا ہی اِسم شریف ہے؟''

'' تخلّص ہے میرا۔ فرمائیے۔''

''ہماری مالکن نے یہ رقعہ بھیجا ہے!''

فدّن نے رقعہ مرزا کے ہاتھ میں تھمادیا۔ غالب نے رقعہ کھولا۔ لکھا تھا.......

'' آپ کی غزل ملی تھی۔ ایک مہربان اُوپر آئے اور مکمل کرا گئے۔ غالبًا آپ کے دوست ہیں۔ خُدا اُن کا بھلا کرے۔ پتہ نہیں وہ شعر آپ کے ہیں یا نہیں۔ باقی غزل کے رنگ سے تو آپ کے لگتے ہیں۔ ایک اور غزل عنایت فرمائیں تو تاعمر مشکور رہوں گی۔''

ناچیز۔ ایک مداح غالب کی

"آپ وہاں کیا کرتے ہیں؟"

"مُلازم ہوں اُن کے یہاں۔"

"میرا پتہ کہاں سے مِلا؟"

"ہماری سیڑھیوں کے سامنے ایک کُتب فروش کی دُکان ہے۔ میر صاحب کہلاتے ہیں۔ اُن کے یہاں سے۔"

"میرے ساتھ آیئے۔"

"جی حُضور!"

مرزا نے فدّن کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دی۔ وہ اُسے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئے اور جاتے جاتے ہی ایک غزل بُننی شروع کی۔

دِل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اِس درد کی دوا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

اور مرزا نے نئی غزل لکھ کر فدّن میاں کو دے دی۔

4

وہی غزل کُچھ دِنوں کے بعد نواب جان کے کوٹھے پر گونجی۔

دِل ناداں تُجھے ہوا کیا ہے
آخر اِس درد کی دوا کیا ہے

طرح طرح کے لوگ، طرح طرح کے شوق۔ لیکن نواب جان کے ہاں سبھی کی دل جوئی ہوئی۔ جن میں شہر کا کوتوال بھی شامل تھا۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

5

غالب کی بیٹھک میں دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ امراؤ بیگم کھانا کھا رہی تھیں۔ اِتنے میں بیگم کو ڈھونڈتے ہوئے مرزا آ گئے۔

اُن کو آتا دیکھ امراؤ بیگم نے پوچھا۔

"آپ کب لوٹے؟"

مرزا حیران ہوئے۔

"کہاں سے؟"

"ہمیں کیا معلوم کہاں جاتے ہیں آپ؟"

مرزا ذرا قریب آکر بیٹھ گئے تھے۔ بیگم نے آہستہ سے دوپٹا ناک پر رکھا کہ شراب کی بو نہ آئے۔

"آج تو گھر سے کہیں نکلا ہی نہیں بیگم!"

مرزا نے ہاتھ بڑھا کر بیگم کی طشتری سے ایک بوٹی اُٹھانے کی کوشش کی۔ بیگم نے طشتری اپنی طرف کھینچ لی۔ اور کلیان کو مرزا کے برتن لانے کے لیے کہا۔

''کلیان! ذرا اِن کا طشتری پیالہ لے کر آؤ۔''

مرزا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

'' ہمارے برتن کیا الگ کر دیئے آپ نے؟''

'' نہیں، میں نے اپنے برتن الگ کر لیے ہیں۔''

مرزا کو بُرا لگا لیکن ناراضگی جتائی نہیں۔

'' بُرا نہ مانیے گا! اپنے ایمان کے لیے ڈرتی ہوں۔''

'' ہاں بیگم! ڈر اُسی کو ہوتا ہے جس کے پاس کچھ پونجی ہو۔ تمہارے پاس ایمان ہے، اس لیے ڈرتی ہو اور ہمارے پاس.....''

مرزا نے بیگم کی طرف اُنگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

'' .....اور ہمارے پاس اِس ایمان والی کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

امراؤ بیگم نے پھر بنیادی سوال اُٹھایا۔

'' آپ اِس طرح خُدا کی ذات سے منکر کیوں ہیں؟''

'' توبہ کرو۔ خدا سے منکر کہاں؟ فرق صرف اِتنا ہے کہ سب کی طرح دوزانو ہو کر گو گڑاتا نہیں اُن کے سامنے۔ بچوں کو ماں باپ سے کبھی اِس طرح گڑگڑا کر مانگتے دیکھا ہے، جیسے تم مانگتی ہو!...... میرے تعلقات خُدا کے ساتھ تم سے زیادہ بے تکلف ہیں۔''

'' ہاں! اِسی لیے وہ آپ کی سُنتے نہیں۔''

مرزا نے مُسکرا کر جواب دیا۔

'' شاید وہ شاعری نہیں سمجھتے، اور وہ بھی میری۔''

اب امراؤ بیگم کھڑی ہو گئیں اور پھر توبہ کی۔

'' استغفراللہ ...... اللہ میاں اِس انا کے لیے معاف کرنا اِنہیں۔''

6

میر صاحب اپنی کتابوں کی دُکان میں، ایک پلندہ کاغذ میں سے کوئی کاغذ ڈھونڈ رہے تھے کہ ایک برقعہ پوش خاتون داخل ہوئی۔ یہ نواب جان تھی۔ میر صاحب نے پوچھا۔

"فرمائیے محترمہ؟"

"غالب نام کے ایک شاعر ہیں۔ پورے نام سے ناواقف ہوں۔ اُن کا مجموعہ کوئی شائع ہوا ہے؟ کوئی کلیات یا دیوان مل سکتا ہے؟"

"دیوان تو نہیں چھپا غالب کا۔ ہاں کبھی کبھار کوئی غزل کوئی شعر لکھ جاتے ہیں جب آتے ہیں میرے یہاں۔"

نواب جان خوش ہوئی۔

"کیا ....کیا فرمایا؟....غالب.....غالب کیا آتے ہیں یہاں؟"

میر صاحب بھی ساری بات سمجھ گئے۔

"جی....جی ہاں یہ .....اُنہیں کے ہاتھ کے لکھے اشعار ہیں۔"

میر صاحب نے غالب کی تحریر دکھائی۔ نواب جان نے پڑھی۔ ایک بار دوہرائی بھی۔

آگے آتی تھی حالِ دِل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

"....واہ خوب ... یہ اشعار مجھے دیں گے آپ؟"

"اِس کے لیے اُن سے اجازت لینی پڑے گی محترمہ! اس طرح پہلے کسی نے اُن کے اشعار چاہے نہیں۔"

اُسی وقت مرزا غالب داخل ہوئے۔

"لیجیے وہ آ گئے۔"

نواب جان اُن کی طرف مُڑی اور نقاب اُٹھا لیا۔ نواب جان جیسے سکتے میں آ گئی۔ غالب نے میر صاحب کو سلام کیا۔

"اوہ! آپ! آپ ہی اُس دِن تشریف لائے تھے اُوپر!"

"جی ... وہ گستاخی مجھی سے سرزد ہوئی۔"

نواب جان بڑی شرمندہ تھی۔

"میں نگوڑی ...گھر میں بھی نہیں بُلایا۔ دروازے سے ہی لوٹا دِیا آپ کو۔"

"میں گیا وقت نہیں ہُوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں!"

نواب جان نے میز سے وہ غزل اُٹھالی جو میر صاحب نے دِکھائی تھی۔

"یہ اشعار رکھ سکتی ہُوں اپنے پاس؟"

مرزا نے فراخ دِلی سے کہا۔

"رکھ لیجیے۔ نغمہ ہو جاتا ہے واں، گر نالہ میرا جائے ہے!"

"عنایت، عنایت، عنایت آپ کی....."

نواب جان اُٹھی اور ایکدم باہر چلی گئی لیکن جاتے جاتے میر صاحب کو آداب کہنا نہ بھولی۔

"شکریہ آپ کا۔ حاجی صاحب۔"

"جی ... جی"

اور اپنے بالا خانہ کی طرف چل دی!

میر صاحب نواب جان کو جاتے دیکھ مرزا سے مخاطب ہوئے۔

"مرزا جی! اِس بیچاری کی کیفیت مُلاحظہ فرمائی آپ نے؟ رنگ ہی اُڑ گیا تھا چہرے کا۔"

مرزا نے اِسی کیفیت پر شعر پڑھا۔

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازُک بن گیا
رنگ کھُلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

میر صاحب کو غالب کا ایک شعر یاد آیا۔

"آپ ہی کا ایک شعر ہے مرزا نوشہ!"

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

مرزا غالب نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''آپ کی کتابیں واپس کرنے آیا ہوں ..... اچھا چلتا ہوں میر صاحب۔''

میر صاحب حیران، یہ کیا۔ ابھی آئے اور ابھی چل دیے۔

''کہاں؟ ابھی تو رُکے بھی نہیں..... اور کہاں جا رہے ہو؟''

''متھرا داس کی کوٹھی پر.....اُدھار لینے۔''

مرزا غالب نے اپنی مجبوری سمجھائی۔

''خواجہ حاجی خان کے ہاتھ، چھوٹے بھائی کے لیے پیسے بھیجے تھے۔ وہ تو گُم ہو گئے۔ پہنچے نہیں اُن تک...... اب پیغام آیا ہے، کہ جو کچھ تھا اُن کے پاس، وہ اُن کے علاج پر اُٹھ گیا۔''

''مرزا یوسف کے دُشمنوں کی طبیعت ناساز ہے کیا؟''

''جی!..... دِماغ میں خلل پڑ گیا ہے..... بیچارا غم کے احساس سے بچ گیا۔ تین بچے بھائی بھاوج ...... یہ ذمہ داری مجھ پر پڑی.... بوجھ کہوں تو گنہگار.....اور آمدنی ......آپ جانتے ہی ہیں!''

میر صاحب سُن کر خاموش رہے اور مایوس بھی ہوئے۔ مرزا نے اِجازت مانگی۔

''چلتا ہوں.... آداب!''

7

میاں قدن نے اُنہیں راستے میں ہی روکا۔ یہ واقعہ ٹھیک حاجی میر کی دُکان کے آس پاس پیش آیا۔

''حُضور۔ ذرا رُکیے....''

غالب ٹھہر گئے۔

''قبلہ۔ ایک مصرع کا مطلب پُوچھنے کے لیے بھیجا ہے نواب جان نے۔''

''خوبصورت نام ہے! .... فرمائیے؟ کیا مصرع ہے؟''

واں وہ غرور عز و ناز

یاں یہ حجاب پاسِ وضع

غالب نے جواب دیا۔
"کہیے گا ۔

راہ میں ہم ملیں کہاں
بزم میں وہ بُلائے کیوں

"شکریہ"
اور فذن مصرع دوہراتے ہوئے چلا گیا۔ مرزا اُسے جاتے دیکھتے رہے۔ پھر ایک اور شعر کہا۔

قاصد کے آتے آتے خط اِک اور لِکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لِکھیں گے جواب میں

8

گھر پہنچتے پہنچتے غزل پوری ہوئی۔ غالب چھت پر پہنچے۔ رومال سے ایک ایک گرہ کھولی ایک ایک شعر یاد آیا اور اُنہیں قلم بند کرتے گئے۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں ، جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

مُجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کُچھ مِلا نہ دیا ہو شراب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

سات

1

ایک انگریز گھوڑ سوار چوک سے گزر رہا تھا کہ ایک پٹاخہ گھوڑے کے سامنے آ کر پھوٹا۔ گھبرا کر گھوڑا پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ گورا گھوڑے کو سنبھال نہ پایا اور زمین پر گر پڑا۔ اُس نے انگریزی میں گالی بکی۔ چوک سکتے میں آ گیا۔ جو دُکانوں میں بیٹھے تھے اُنہوں نے نظریں جھکا لیں۔ جو خریداری کر رہے تھے گلی کوچوں میں روپوش ہو گئے۔ کچھ مسجدوں میں چھپ گئے۔ گورا تب تک سنبھل چکا تھا۔ اب وہ چلانے لگا۔

''کون ہے۔ یو سن آف اے بچ؟ کم آؤٹ۔''

پہلی منزل اور دوسری منزل کی کھڑکیاں دھنا دھن بند ہونے لگیں۔ ایک برامدے میں اُستاد ابراہیم ذوق کھڑے دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک پٹاخہ پھوٹا، پھر...... ایک خاص وقفے کے بعد جگہ جگہ دھماکے ہونے لگے۔ گورا اب سچ مچ خوف زدہ تھا۔

اُستاد ذوق برآمدے سے کمرے میں چلے گئے اور دروازے پر پردہ گرا دیا۔

اندر کمرے میں آتش دان کی گرمی سینکتے مومن، مُفتی اور دیگر شعرا بیٹھے شعر و سُخن میں مشغول تھے۔ واہ واہ کی آواز آ رہی تھی۔ حضرت ذوق نے ہاتھ رگڑے اور فرمایا۔

''بھائی معاف کیجیے گا۔ ہم نے شمر رارشاد فرمایئے۔''

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

''واہ واہ سُبحان''

حال دِل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دِل سے جُدا نہیں ہوتا

چارۂ دِل سِوائے صبر نہیں
سو تمہارے سِوا نہیں ہوتا

مومن نے واہ واہی لُوٹ لی۔ اب ذوق نے اپنا کلام سُنانے کی اجازت چاہی۔
''حضرات! اگر اجازت ہوتو ایک تازہ غزل کے چند اشعار پیش کروں!''
ایک شور اُٹھا!
''اِرشاد! اِرشاد!''
اِتنے میں باہر ایک اور دھماکہ ہُؤا۔ مومن نے گھبرا کے پوچھا۔
''یہ کیا چل رہا ہے باہر؟''
شیفتہ نے اُکتائے انداز میں کہا۔
''کچھ پٹاخوں کی آوازیں سُنائی دے رہی ہیں۔''
''جی ہاں! گولی چلتی تو ساتھ میں چیخ بھی سُنائی پڑتی۔''
ذوق نے اطلاع دی۔
''کچھ نہیں ایک فرنگی سپاہی نکل آیا ہے چوک میں۔ لوگ اُسے پریشان کر رہے ہیں۔ دو گورے ہوں تو سارا شہر گھبرا جاتا ہے۔ اکیلا ہو تو....''
مفتی صاحب نے ذوق کی بات کاٹی۔
''شہر کہاں صاحب! اب تو سارا مُلک گھبراتا ہے۔''

شیفتہ نے اُسی انداز میں کہا۔
"آپ شعر اِرشاد فرمایئے قبلہ! وہ تو روزمرہ کا قِصہ ہے۔ آپ کا کلام پھر کب سُننے کو ملے گا۔"
" عرض کیا ہے۔"

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دُنیا سے دِل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دِل لگی چلے

کم ہونگے اِس بساط پر ہم جیسے بد قِمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بُری چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

2

صادق میاں کا چبوترہ تبھی رنگ میں آتا تھا جب چار پانچ جُواری اور کچھ تماش بین موجود ہوں اور اگر مرزا غالب بھی کھیل رہے ہوں تو سونے پہ سُہاگا۔ جواری داد دے رہے تھے۔
" واہ واہ مرزا ! کیا کوڑیاں پھینکتے ہو!"
" کمال کرتے ہو بھئی۔"
صادق نے کہا۔
"آپ کے ساتھ جُوا کھیلنا تو سراسر گھاٹے کا کام ہے نوشہ میاں!"

ایک خبری نے آ کر بتایا کہ کوتوال آ رہا ہے۔ دوسرے خبری نے نوشہ میاں کو خبر دی۔

" مرزا نوشہ! کوئی صاحب آپ کے لیے کسی کا رقعہ لے کر آئے ہیں۔"

مرزا نوشہ نے نظر اُٹھا کر دیکھا نواب جان کا مُلازم فدّن میاں تھے۔ فدّن مرزا کی طرف آیا اور سلام بجالایا۔

"آ جاؤ میاں! بھئی پہلے اپنا اِسم شریف بتاؤ۔"

" خاکسار کو ' فِدّن ' کہہ کر بُلاتے ہیں۔"

"ہاں تو فِدّن میاں۔ کیسے آنا ہوا؟"

" آپ کے دولت خانہ پہ حاضر ہوُا تھا۔ پتہ چلا آپ یہاں تشریف رکھتے ہیں۔"

پھر دبی آواز میں کہا۔

" ایک رقعہ ہے۔ نواب جان کی طرف سے۔"

جُواریوں اور تماشہ بینوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ مرزا نے رقعہ لے لیا اور کھول کر پڑھنے لگے۔

" ....کیا غریب خانہ پر ایک بار تشریف لائیں گے۔ آپ کی غزل آپ کے ہی سامنے پیش کرنا چاہتی ہوں۔ لِللہ، مایوس نہ کیجیے گا۔ آپ کے قدم پڑنے سے اِس غریب خانہ کا مقدر جاگ اُٹھے گا۔ شاید کسی کو جیتے رہنے کی وجہ مل جائے۔ نیاز مند۔ نواب جان۔

رُقعہ پڑھ کر مرزا خُوش ہوئے۔ مرزا فدّن کی طرف مڑے اور فرمایا۔

"اُن سے کہہ دیجیے۔ میں اُڑنے سے پہلے گرفتار ہو گیا۔ پاؤں میں بیڑی پڑی ہے۔ قید عزیز تو کسی کو نہیں ہوتی لیکن اب قید کی عادت میں قید ہوُں۔"

"کیا تشریف لائیں گے؟"

غالب سوچ میں پڑ گئے۔ جواب کیا دیں وہ یہ فیصلہ نہیں کر پائے۔

" وعدہ تو نہیں کرتے......."

پھر بھی۔ کُچھ نہ کچھ کہنا تھا۔ کہا...

" شاید آ بھی جائیں۔"

" عنایت!"

فدّن میاں نے پیشانی چھو کر آداب کیا اور چلے گئے۔ اُس کے جاتے ہی سبھی کی نظریں مرزا پر تھیں۔ صادق میاں پوچھ بیٹھے۔

''کون ہے؟ کس کا پیغام لے کر آیا تھا۔''

مرزا کی چھاتی پھول گئی۔

'' مُغل بچے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اُسے مار رکھتے ہیں۔ایک ڈومنی کو ہم نے بھی مار رکھا ہے۔''

جوش میں آ کر مرزا غالب نے کوڑیاں پھینکی اور کوڑیوں کی کھنک کافی دیر اُن کے کانوں میں گونجتی رہی۔

3

غم دوراں نے مرزا کو زندگی بھر ستایا۔لیکن غم جاناں سے بھی اچھوتے نہ رہے۔آج نواب جان سج دھج رہی تھیں۔مُشاطہ نے پیروں میں مہندی رچائی۔نواب جان نے روزمرّہ سے زیادہ گہنے پہنے۔اِس بیچ اُس کی ماں ملکہ جان آ گئی۔ملکہ کا ماتھا ٹھنکا۔

''کیا بات ہے؟ آج کوئی خاص ہی اہتمام ہو رہا ہے۔شام ہونے میں بہت دیر ہے ابھی۔''

نواب جان مُسکرا دی۔

''امّی! میری چوٹی آپ خود ہی بنا دو آج۔''

'' ہوں! کون آ رہا ہے آج؟''

'' جن کا کلام گاؤں گی آج ..... مرزا غالب!''

''اِس غریب خانہ پر آئیں گے وہ؟''

نواب جان جانتی تھی کہ وہ یقیناً آئیں گے۔اُس نے سر ہلا کر ہاں کر دی۔

'' اُس پہ بن جائے کُچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے۔''

نواب جان نے ماں کا ہاتھ تھام لیا۔

''اماں! کسی نے خُوب کہا ہے وہ کوئی چاند سورج ہیں جو روز چلے آئیں گے۔اُن کا مقام تو اُن سے بھی پرے ہے۔''

4

مشاطہ نواب جان کو سجا سنوار رہی تھی۔ ادھر مرزا غالب کے گھر میں بھی کچھ ایسا ہی نظارہ تھا۔

مرزا نواب جان کے ہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کپڑے پہن لیے تھے اور اب پُرانا چغہ پہننے والے تھے کہ امراؤ بیگم نے اعتراض کیا۔

"وہ رہنے دیجیے۔ یہ..... یہ نیا چوغہ بنوایا ہے۔ آپ کے لیے! ..... یہ پہن کر جائیے۔"

امراؤ نے خود اُنہیں چوغہ پہنایا۔ مرزا حیرانی سے دیکھتے رہے۔

"بیگم! کیوں ایسے دُلہوں کی طرح تیار کر رہی ہو ہمیں! جانتی بھی ہو کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟...... ایک ڈومنی کے کوٹھے پر جا رہے ہیں۔ سُنا ہے ہم پہ مرتی ہے وہ!"

بیگم نے ہنس کر جواب دیا۔

"کیوں نہ مرے گی؟ ہمارا انتخاب کیا اِتنا معمولی ہے!"

"اوہو! کیا بات ہے، آج بہت مہربان ہو؟"

اِس سوال کا جواب امراؤ نے نہیں دیا بلکہ چوغے کی سلائی کی بات کہی۔

"گلا ٹھیک ہے چوغے کا؟"

امراؤ کا سارا دھیان چوغے کے گلے کی طرف تھا۔ اُنہوں نے ایک تجربہ کار درزی کی طرح چوغے کے گلے کے کاٹ کا معائنہ کیا۔ اُن کی سونی بانہہ مرزا کی نظر کے سامنے تھی۔ کلائیوں میں چند کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ گلا خالی تھا۔ کان میں دو معمولی سے بُندے مرزا کی آنکھوں میں ماضی کی ایک جھلک کوندگئی۔

5

وقت کا وہ حصہ ....جب اسد اور امراؤ بچے تھے اور اُن کا نکاح ہوا تھا۔ اسد اور امراؤ اکے پر سوار۔ رُخصتی کا وقت تھا۔

اکے پر بٹھانے کے لیے جب اسد نے اپنی بیگم کا ہاتھ تھاما تھا۔ تب اُس کی کلائیوں میں سونے کے کتنے ہی جڑاؤ زیور تھے۔ کلائیوں میں کنگن۔ اُن کی اُنگلیوں میں انگوٹھیاں، کانوں میں بُندے، گلے میں چندر ہار، موتیوں کی لڑیاں، ناک میں ہیرے کی نتھ، مانگ میں جڑاؤ ٹیکا۔

پہلی بار اسد نے اپنی بہو بیگم کا یہ روپ دیکھا تھا۔ بیگم کی بند مُٹھیوں پر بھی نظر پڑی۔ آنکھوں آنکھوں سے پوچھا کیا چھپائے لے جا رہی ہو۔ بیگم نے مُٹھیاں کھول دیں۔ کنچے تھے اور کنچے اسد کو دیے۔ اسد نے گِنے پورے سات نکلے دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں مُسکرا دیے تھے۔

6

مرزا غالب ماضی سے حال میں لوٹے۔ اب اُنہوں نے نیا چوغا پہن لیا تھا۔ ایک بار مرزا نے اپنے نئے چوغے کو دیکھا۔ ایک بار پھر نظر امراؤ کے سُونے گلے پر پڑی۔ لیکن امراؤ کی نظر مرزا اور اُن کے نئے چوغے پر تھی۔

"اچھا لگ رہا ہے۔"

" چوغا یا ہم؟"

پھر خاموشی کے چند لمحے۔

'' کچھ کہا آپ نے؟ بہت چپ ہیں۔''

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

'' آپ سے تو بات کرنا محال ہے۔ بات بات پہ شعر کہتے ہیں۔''

مرزا پھر خاموش رہے۔

''ہم نے کچھ پوچھا تھا آپ سے؟ کہاں ہیں آپ؟''

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

7

آج نواب جان کا کوٹھا جگمگا رہا تھا۔ نوکرانی ایک اور شمع لے کر آ گئی۔ نواب جان اِس وقت چلمن سے نیچے گلی میں آنے جانے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ اُسے مرزا غالب کا انتظار تھا۔

'' باجی! کیا ہؤا؟ پھر اُداس ہوگئیں آپ؟''

''نہیں تو .....بس آتے ہی ہوں گے۔ اچھا دیوان خانے میں سارے چراغ جلا دیئے؟''

''جی باجی! سازندے بھی کب کے آ گئے ہیں۔''

اِس بیچ دیوان خانہ سے سارنگی کی آواز آ رہی تھی۔ ساز پہلے ہی مِلا دیے گئے تھے۔نواب جان نے پردے کی اوٹ سے دیوان خانے کا جائزہ لیا۔کوتوال ابھی ابھی داخل ہؤا تھا۔نواب جان نے پردہ گرا دیا۔ مرزا ابھی بھی نہیں آئے۔نواب جان کے صبر کا پیالہ لبریز ہو رہا تھا۔اُس نے پھر گلریز کو تاکید کی۔

'' گلریز! مرزا کا گاؤ تکیہ دائیں طرف لگوا دینا۔''

باہر سے گلریز نے 'جی' کہا۔

8

دیر تیسرے پہر مرزا غالب سیٹھ سُکھ چین کی پیڑھی پر پہنچے۔ اُنہوں نے کچھ سونے کی مہریں مرزا کو دے دیں۔ مرزا نے 'پرونوٹ' پر دستخط کرنے کے لئے قلم ہاتھ میں لے لیا۔

''یک لخت اتنی رقم کی کیا ضرورت پڑگئی، مرزا صاحب؟ کہیں سفر پر جا رہے ہو؟ اِرادہ کیا ہے؟''

مرزا نے کوئی جواب نہ دیا۔ کاغذ پر دستخط کیے۔ پیسے اُٹھائے اور آداب کہا۔

''اجازت دو لالہ۔ آداب۔ خُدا حافظ۔''

مرزا پیڑھی سے باہر آ گئے۔

9

نواب جان کا کوٹھا۔ نواب جان بیٹھک کے بیچوں بیچ بیٹھی تھی۔ اُس نے ایک لمبا آلاپ لیا۔ اور ہاتھ کی ہتھیلی سے 'بھاؤ' دِکھائے۔ ہتھیلی پہ مہندی۔ اور مہندی سے لکھا 'مرزا'۔ کوتوال کی نظر پڑی۔ اُس نے ٹوکا۔

'' یہ کیا لکھا ہے؟ مرزا؟ مرزا کون؟''

نواب جان نے دونوں ہتھیلیاں سامنے کر دیں۔ ایک پر مرزا لکھا تھا دوسری پر غالب۔ کوتوال نے نام ملا کر پڑھا۔

'' مرزا غالب!''

کوتوال نے مذاق کیا۔

'' یہ کس کنگال سے دل لگا بیٹھی ہو۔ قرضدار ہے زمانے کا۔''

''اور اُن کا جو قرض چڑھ رہا ہے زمانے پر؟ اُسے چکاتے چکاتے دلّی کی نسلیں گذر جائیں گی پھر بھی چکتا نہیں ہوگا۔''

کوتوال کو نواب جان کی بات پر بہت غصہ آیا۔

''اوہو! کیا جانتی ہو اُس کے بارے میں؟ جب بھی بلّی ماراں سے گزرتا ہوں، بیٹھا ہوا جُوا کھیلتا دکھتا ہے۔ کسی دن دھر لیا جائے گا۔ نہ دین کا نہ دِل کا۔ دونوں سے کورا۔''

نواب جان مُسکرا دی اور اُس نے ایک شعر عرض کیا۔

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز۔ اُس کی گلی میں جائے کیوں

10

مرزا گھر لوٹ گئے۔ اُن کے پاس زیورات کی پوٹلی تھی۔ اُنہوں نے زیور امراؤ بیگم کو پیش کیے۔

''لو پہن لو اِنہیں! گلے اور ہاتھوں میں۔''

امراؤ نے اُن کی طرف دیکھا۔ اِس نظر میں محبت تھی۔ ناراضگی بھی تھی۔ مرزا کی ذات کو لے کر عزّت بھی تھی۔

''پھر قرض لیا آپ نے؟''

مرزا نے سر ہلا کر ہاں کہا۔

''کس سے؟''

'' متھرا داس سے اور نہیں ملتا۔ سیٹھ سُکھ چین سے لایا ہوں۔''

''لیکن ایسی کیا ضرورت پڑی تھی کہ......''

مرزا نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''یہ کانچ کی چوڑیاں اُتار دو اور کڑے پہنو!''

مرزا نے کانچ کی چوڑیاں اُتارنے کی کوشش کی۔ ایک آلاپ اُن کے کانوں میں گونجا۔

11

نواب جان نے اپنے کوٹھے پر ایک غزل چھیڑی۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وِصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے ، یہی اِنتظار ہوتا

اگلا شعر کوتوال کے لیے تھا۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا ، کوئی غم گسار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلِش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا ، اگر ایک بار ہوتا

آٹھ

1
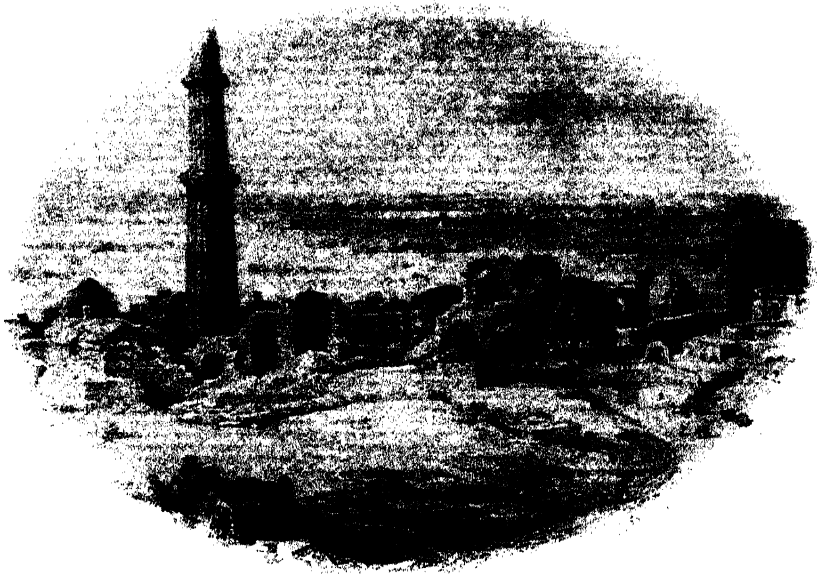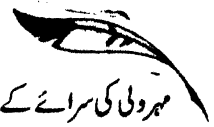
مہرولی کی سرائے کے پاس کی امرائی میں دو گھوڑے بندھے تھے کچھ کرسیاں لگی تھیں۔ مرزا غالب اور شمس چہل قدمی کر رہے تھے۔ شمس کی بانہہ میں پٹیاں بندھی تھیں۔ غالب پنشن کے سلسلے میں پریشان تھے۔

''لیکن اس بات کو بھی ایک برس ہوا شمس! تم نے کہا تھا کہ وہ فرنگی.... کیا نام تھا اُس کا ..... ولیم فریزر .....وہ تمہاری مدد کرے گا۔''

''اُسے تو اللہ قسم .... اُس کا خون کر دوں گا میں۔''

مرزا نے شمس کی طرف دیکھا۔

''اوّل تو ہر بات پہ قسم مت کھایا کرو اللہ کی۔ اور کھاؤ تو کسی بھلے کام کے لیے کھایا کرو۔''

شمس کے پاس کوئی تسلی بخش جواب نہ تھا۔

''اور اُس کا کیا ہوا؟ حاجی کا ....؟ میرے پیسے تو نہیں پہنچائے یوسف تک۔''

'' وہ تو میرا بھی روپیہ کھا گیا۔ پچھلے آٹھ ماہ سے غائب ہے۔''

''تو پھر اُس درخواست کا کیا ہوا جس پر مُجھ سے دستخط کرائے تھے تُم نے۔''

'' فریزر کا کہنا ہے کہ وہ درخواست کلکتہ بھجوادی ہے۔ جنرل مٹکاف ہی فیصلہ کریں گے۔ اور .....''

شمس بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

''اور کیا؟... کُچھ کہنا چاہتے تھے تُم؟''

''لگتا ہے کلکتہ گئے بغیر بات نہیں بنے گی۔''

'' کلکتہ جانے کا اِرادہ کر رہے ہو تُم؟''

'' نہیں مُجھ میں اِتنی سکت نہیں۔ عارف کے دونوں بالغ بچوں کا بھار بھی مجھ پر ہے۔ تمہارے بھانجے ہیں۔ تم پہ یوسف مرزا کا بوجھ نہ ہوتا تو تم سے کہتا، یہ بھار بھی تم ہی اُٹھالو۔''

مرزا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شمس نے پھر پوچھا۔

" باجی کیسی ہیں؟"

"امراؤ؟.....اچھی ہیں۔ پھر اُمید سے ہیں۔ اللہ نے اولاد تو بخشی مگر اُنہیں زندگی نہ بخشی۔ اب اور زیادہ پرہیز گار ہو گئی ہیں۔ ہر پیر، ہر فقیر کی درگاہ پر جا کر منت مانگ آتی ہیں۔ بضد رہتی ہیں کہ میں بھی طواف کروں۔ کچھ چڑھا کے آ جاؤں!"

چلتے ہُوئے دونوں گھوڑوں کے قریب آ گئے اور اُن پر سوار ہو کر چلے گئے۔

2

مرزا غالب کے گھر پر دو آدمی اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ وفادار اُنہیں سمجھا کر ٹالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنے تتلاتے ہُوئے لہجے میں۔

"حضرات! مرزا صاحب مہرولی گئے ہیں۔ لوٹتے ہوئے شاید دیلی (دیری) ہو جائے۔ ہم خبل کل (خبر کر) دیں گے کہ آپ آئے تھے.... ھُضول کی جاکیل (ھُضور کی جاگیر) بس ملنے والی ہے۔"

بنئے نے اپنا مقصد بیان کیا۔

"ہمیں تو ہمارے دام واپس چاہئیں بی بی! جاگیر نہیں۔ مرزا سے کہہ دینا، خُود ہی آ کے دے جائیں دُکان پر۔ تقاضہ کرتے ہمیں اچھا نہیں لگتا۔"

بنیا بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ لیکن بزاز کھڑا رہا۔ اور تھوڑی دور پہ ایک کھمبے کی آڑ میں فِدّن بیٹھا تھا۔ اُسے بھی مرزا جی کے لوٹنے کا انتظار تھا۔ ایک مانگنے والے کو ٹال کر وفادار اب دوسرے سے مخاطب ہُوئی۔ یہ دوسرے آدمی سعید صاحب تھے جن کی بزازی کی دُکان تھی۔

"آپ بھی تشریف لے جائیے، سعید صاحب! ایک شاعر کو پریشان کر کے کیا ملے گا آپ کو؟"

" ہم کہاں پریشان کرتے ہیں بی بی۔ تُمہیں نے بُلایا تھا آج کے روز!"

" تو ہمیں تھوڑا ہی خبل (خبر) تھی کہ ھُضول (ھُضور) کو علی الصبح مہرولی جانا پڑ جائے گا۔"

" تو پھر کب آئیں؟"

'' فضول (فضور) سے بات کرکے خبل کل (خبر کر) دیں گے آپ کو۔ خُدا حافظ۔''

وفادار پنڈ چھڑا کر اندر چلی گئی۔ سعید صاحب بھی مُڑے جانے کے لئے اِتنے میں مرزا صاحب آتے دِکھائی دیئے تو سعید صاحب رُک گئے۔

'' تسلیم!''

'' تسلیمات۔ فرمائیے۔''

''عرض یہ ہے مرزا کہ وفادار کپڑا لے گئی تھیں پچھلے مہینے۔ کہا تھا بیگم نے منگوایا ہے۔ مرزا کا چوغہ بنے گا۔

مرزا مُسکرا دیے۔

''قرض لینے کو میں کم تھا کہ بیگم نے بھی اُدھار لینا شروع کر دیا۔''

'' لیکن ہمیں تو کہا گیا تھا کہ..........''

مرزا نے بیچ میں ہی روک دیا۔

''سعید صاحب۔ اچھی بھلی پنشن آتی تھی، رُک گئی..... ہیرا لال وکیل ہیں نا۔ مقدمہ اُن کے ہاتھ میں ہے۔ آج ہی اُن سے مِل کے پوچھتا ہوں۔''

'' مرزا شرمندہ مت کیجئے ہمیں۔ ہم تقاضہ کرنے نہیں آئے۔ بُلایا نہ گیا ہوتا تو کبھی نہ آتے۔ آداب!''

سعید صاحب بالکل بھی نہ رُکے۔ بات ختم کر کے چلے گئے۔ مرزا نے بڑی شرم محسوس کی۔ دو بول بول گئے ہوتے تو بُرا نہ لگتا۔ بنا بولے چلے گئے۔ یہ وار جھیلنا مرزا کے لیے مُشکل تھا۔ مرزا سعید صاحب کو جاتے ہُوئے دیکھتے رہے اور ایک شعر کہا۔

قرض کی پیتے تھے مئے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا اندر جانے ہی لگے تھے کہ پھر ایک 'آداب' سُنائی دیا۔ مرزا بُد بدائے۔ اب کون 'آداب' کرنے آ گیا؟ وہ مڑے۔ دیکھا، فدّن میاں ہیں۔ فدّن کھمبے کی اوٹ سے نمودار ہُوئے تھے۔

'' مرزا صاحب آداب!''

مرزا نے پیشانی چھو کر آداب کا جواب دیا۔ فدّن نے ایک رقعہ پکڑا دیا۔ مرزا نے رقعہ کھولا۔ شعر اُنہیں کا تھا۔ لیکن آواز نواب جان کی تھی یہ بھی ایک تقاضہ ہی تھا۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

مرزا نے رُقعہ کو جیب میں رکھا اور فدّن میاں کو جواب دیا۔

وفا کیسی ، کہاں کا عشق ، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل ، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

جواب دے کر مرزا غالب اندر چلے گئے۔ جواب کا بوجھ اب فدّن میاں کے کاندھے پر۔ وہ شعر یاد کرتا ہُوا لوٹ گیا۔

"وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
وفا کیسی، کہاں کا عشق جب.......
وفا کیسی، کہاں کا عشق......
وفا کیسی ...."

شعر بھول نہ جائے اِس لیے فدّن تیز قدم بڑھاتا ہوا کوٹھے کی جانب روانہ ہو گیا۔

3

نواب جان کا کوٹھا۔

تیز تیز سیڑھیاں چڑھ گیا فدّن میاں، اور شعر کا وزن اُتار دیا نواب جان پر۔

"تو پھر اے سنگ دل ۔ تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو"

سوال کا جواب بہت بھاری پڑا نواب جان پر۔ اُس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ اتنے میں ایک چوڑی کے ٹوٹنے چٹکنے کی آواز آ گئی۔

چوڑی فروش رُکمنی نواب جان کو چوڑیاں پہنا رہی تھی۔ رُکمنی کا کوٹھے پر آنا جانا تھا۔ نواب جان اور ملکہ

پُرانے گراہک تھے۔ایک اور چوڑی چٹکی۔

"آج کتنی چوڑیاں توڑے گی؟.....کیا اِتنا سخت ہوگیا ہے میرا ہاتھ؟"

رُکمنی خاندانی چوڑیوں والی تھی۔گاہک کو کیوں دوش دیتی۔اُس نے اپنے ہی مال میں کھوٹ نکالی!

"نابی بی! میری چوڑیاں ہی موئی خستہ جان ہوئی جاتی ہیں۔اِن سب میں وہ دم کہاں، جو اِن بانہوں کی زینت بنیں!"

فدّن میاں بیچ میں کود پڑے۔

"ایں! باتیں خوب بنالیتی ہو رُکمنی تائی۔"

"اے ہے! تمہاری تائی کیوں ہونے لگی فدّن میاں۔"

نواب جان کو فدّن میاں کی زبان درازی اچھی نہیں لگی اُس نے فدّن کو ڈانٹ دیا۔

"تم جاؤ فدّن ......تھوڑی دیر میں آنا۔جب بھی رُکمنی آتی ہے تم آس پاس منڈلانے لگتے ہو!"

فدّن میاں سیڑھیوں کی طرف بڑھے تو نواب جان نے ٹوکا۔

"کہیں چنڈو خانہ میں تکیہ مت کر لینا جا کے ..... پھر دو دن بعد نظر آؤ گے۔"

فدّن نے کان پکڑے۔ پھر رُکمنی کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔ رُکمنی نے بھی دیکھا۔ فدّن میاں سیڑھیاں اتر گئے۔رُکمنی چوڑیاں پہناتی رہی۔نواب جان نے شعر گنگنایا۔

وفا کیسی، کہاں کا عشق ، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل ، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

ملکہ اندر سے آئی۔ بیٹی کو گنگناتے سُنا تو اچھا لگا اور پوچھ بیٹھی۔

"یہ نیا کلام کِس کا ہے؟"

نواب جان مُسکرا دی۔سر وہیں دروازے پر ٹکا دیا۔جواب بھی نہ دیا۔ملکہ نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔

"وہی؟ مِرزا غالب!"

نواب جان مُسکرا دی۔ ملکہ نے آگاہ کر دیا اُسے۔ دُنیاداری کا سمجھانا اُس کا فرض تھا۔

"مِرزا غالب سے تمہارا اُنس کوتوال شہر کو پسند نہیں۔"

نواب جان نے آہستہ سے اپنا جواب سُنا دیا۔

"میں کوئی اُس کی زر خرید نہیں ہوں!"

'' زر خرید تو کوئی نہیں اُس کا بیٹی۔ لیکن شہر میں اُسی کا طوطی بولتا ہے۔''

نواب جان کو غصہ آیا۔

'' تو؟''

ملکہ نے نرمی سے سمجھایا۔

''تیری وجہ سے کہیں اُس غریب شاعر پہ نہ آ بنے!''

نواب جان سوچتی رہ گئی۔

4

ہیرالال کا صبر ٹوٹ گیا۔ وہ مرزا سے کھری بات کہنے کے لیے مجبور ہو گئے۔

''یہ سارا قرض کیسے چکے گا مرزا؟ بے تحاشہ خرچ کرتے ہو۔ اِتنے مقدمے لڑو گے کیسے؟''

مرزا خاموش ہی رہے۔ ہیرالال اُن کے خیر خواہ تھے۔ یہ آگاہی بھی ضروری تھی۔

'' اِدھر متھرا داس ڈگری کر رہے ہیں تم پر۔ اُدھر گھر پر تقاضہ کرنے والوں کا تانتا لگا ہُوا ہے۔ اور پنشن کا ابھی کُچھ پتہ نہیں۔ کیا جانے کب ملتی ہے۔ خُدا کرے کہ فیصلہ تُمہارے حق میں ہو جائے لیکن.....''

مرزا نے ٹوک دیا۔

''اگر کچہری کے فیصلے بھی خُدا ہی کرے گا ہیرالال! تو پھر آپ کِس بات کی وکالت کرتے ہیں؟ آپ کو مقدمہ سونپا تھا کہ آپ میرا حق مجھے دلا دیں!''

ہیرالال مسکرا دیے۔

''اور میرا حق؟ وہ کب ملے گا!''

مرزا جوتی پہننے لگے۔ ہیرالال کو مرزا کے جواب کا انتظار تھا۔

''ساری غزل اچھی تھی ہیرالال۔ یہ مقطع اچھا نہیں لگا...... میری چھنی ہوئی پنشن دِلا دیجیے۔ تو اپنا حصہ لے لیجیے۔ جرح کا کام آپ کا ہے.......ہم سے درخواست لِکھوا لو.......قصیدہ لکھ دیں گے..... حاکم کی تعریف کر دیں گے شعروں میں۔ آگے کام نِکالنا آپ کا کام ہے۔''

مرزا جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اِس بیچ ہرگوپال تفتہ داخل ہو گئے۔ تفتہ مرزا کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔

'' آپ یہاں کیا کر رہے ہیں، اُستاد !''

مرزا نے لمبی سانس لی۔

''اب تک تو سب سے محفوظ جگہ یہی تھی۔ مگر اب ہیرالال بھی معاوضہ مانگنے لگے ہیں۔ چلتا ہوں۔ آداب!''

مرزا ایک دم نکل لئے۔ تفتہ مرزا کی جگہ بیٹھ گئے اور بات وہیں سے شروع کی جہاں مرزا نے چھوڑی تھی۔

''آداب ہیرالال جی! اِس آدمی جیسا انسان دُوسرا نہیں دیکھا۔ پیر کے انگوٹھے سے لے کر سر کے تالُو تک دِل ہی دِل ہے۔''

''صرف دِل سے تو کام نہیں چلتا، بھئی ہرگوپال! دِماغ کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ دس ہزار سے پانچ ہزار ہوئی اُن کی پنشن۔ پانچ سے تین، اور اب ساڑھے سات سو روپے۔ اِن کا اپنا حصّہ اب کُل باسٹھ روپے آٹھ آنے۔ .... یعنی مرزا جو اصل کے حقدار ہیں یوں ہی رہ گئے۔''

'' کُچھ ملنے کی اُمید ہے؟''

'' سب مِل جائے تو مالا مال ہو جائیں گے۔ اور نہ ملا...... تو کنگالی میں عمر کٹے گی!''

'' پر کُچھ ملنے کی اُمید ہے؟''

'' سب کمپنی بہادُر کی مرضی پر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنے بادشاہ کی اب کُچھ نہیں چلتی۔''

تفتہ نے وہی سوال تیسری بار کیا۔

'' پر میں پوچھتا ہوں، کُچھ ملنے کی اُمید ہے؟''

'' ....میرا خیال ہے، جنرل مٹکاف ہی کُچھ کر سکتا ہے، اور وہ آج کل کلکتہ میں ہے۔''

'' تو کلکتہ جانا ہوگا؟''

ہیرالال نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

5

پُرانی دِلّی کی ایک اندھیری گلی میں جہاں اور کئی گلیاں آکر ملتی ہیں، وہاں کُچھ جُواری کوڑیاں کھیل رہے تھے۔ صادق میاں کے چوبارے پر شہر کوتوال کی نظر رہتی تھی۔ یہاں کوئی خدشہ نہیں تھا۔ ایک گلی سے فدّن میاں آتے نظر آئے۔ وہ بھی جُواریوں کے مجمع کے پاس آن پہنچا۔ جُواری آواز لگا رہا تھا۔

" چِت پہ دو ...... چِت پہ دو "

دوسرے جواری نے ہانک لگائی۔ فدّن ایک مکان کی سیڑھیوں کے پاس پہنچ گیا۔

" پٹ پہ تین "

فدّن آدھی سیڑھیاں ہی چڑھا تھا کہ پولس موقعہ پر آ پہنچی۔ فدّن رُکا۔ اُس نے جُواریوں کو بھاگتے دیکھ لیا۔ وہ جلدی جلدی اُوپر چڑھنے لگا کہ دو سپاہی اوپر سے نیچے اُترے ..... فدّن کے بھاگنے کے رستے بند ہوگئے۔ اُوپر سے اُترتے سپاہی نے فدّن کا گریبان پکڑا۔ فدّن نے ایک کوشش کی۔ جھٹکے سے گریبان چھڑا کر زینے سے نیچے کُود پڑا۔ چھن سے اُس کے ہاتھ کی پوٹلی گر پڑی اور کُھل گئی۔ سونے کے زیور جھنجھنا کر زمین پر بکھر گئے۔ وہ زیور بٹورنے لگا کہ اُوپر سے اُترنے والے سپاہی نے اُسے پھر آدبوچا۔ فدّن چلاّ تا رہا۔

" رحم کرو ...... میرے زیورات ...... میں جُوا نہیں کھیل رہا تھا..... زیورات میرے۔"

" جھوٹ بولتے ہو تم۔ چلو !"

اور پولس والے فدّن کو مع زیورات کے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

6

ٹوٹا ہوا بدحال فدّن کوتوال شہر کے سامنے لایا گیا۔ وہ ڈر کے مارے کانپ رہا تھا۔ کوتوال نے باریک چھڑی میز پر ماری اور فدّن سے ڈانٹ کے پوچھا۔

" جُوا کھیل رہا تھا؟"

فدّن کی کپکپی چھوٹی۔

" آپ تو جانتے ہیں مُجھے حُضور .....میں بالکل جُوا نہیں کھیلتا۔ ......مُجھے تو خوامخواہ....."

کوتوال نے ڈپٹ کر پوچھا۔

" یہ زیورات کس کے ہیں؟"

فِدّن مجبور تھا۔ جواب نہیں دیا۔

"کہاں لے جا رہا تھا؟"

"بے ...... بے ...."

" بیچنے لے جا رہا تھا؟"

فدّن خاموش رہا۔ کوتوال نے سوال دوہرایا۔ فدّن کو جواب دینا پڑا۔

" ہوں ....."

کوتوال کی لال لال آنکھیں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ کوتوال نے تیسرا سوال کیا۔

" کس نے بھیجا تھا؟"

فدّن نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے نظریں جھکا لیں۔

" نواب جان نے بھیجا تھا؟"

" نہ ......نہ....نہیں......"

" تو؟ ملکہ نے؟ .... اُس کی اماں نے....."

فدّن نے سچ سچ کہا۔

" نہیں ....."

" چوری کی تم نے ......؟"

فدّن کوتوال کا مُنہ دیکھتا رہا۔ اُسے چُپ دیکھ کر کوتوال کو غصہ آ گیا۔

" تو چوری بھی کرتا ہے؟ چرسی....."

ایک زنّاٹے دار طمانچہ پڑا۔ فدّن کی گھگھی بندھ گئی اور وہ لڑکھڑا کر فرش پر آ گرا۔

7

کوتوالِ شہر تھا تو نواب جان کا شیدائی۔ مگر کمپنی بہادر کے قانون کا حافظ بھی تھا۔ بنا وردی آیا تھا مگر مُجرا سُننے کے لئے نہیں آیا تھا۔ وہ تفتیش کرنے کے لئے آیا تھا۔ اور نواب جان فدّن کی طرف داری کرتی رہی۔

'' اُس نے چوری نہیں کی۔ چھوڑ دیجئے اُسے۔''

کوتوال کا لہجہ کرخت تھا۔ عشق اپنی جگہ ہے۔ کسی بھی مُجرم کی سفارش اُس کے لئے نا قابلِ برداشت تھی۔''

''جھوٹ مت بولو۔ فدّن خود اِقبال کر چُکا ہے اپنے جرم کا۔''

نواب جان بھی طیش میں آ گئی۔

'' اُسے میں نے بھیجا تھا ...... زیورات بیچنے کے لئے سیٹھ سُکھ چین کے پاس۔''

کوتوال کچھ نرم پڑ گیا۔

'' زیورات بیچنے کی تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی؟''

'' ضرورت تھی ...... کِسی کا قرض دینا ہے۔''

'' ہُوں ''

کوتوال اپنی جگہ سے اٹھا اور بیٹھک میں چہل قدمی کرنے لگا۔ پھر اچانک اُس کے ذہن میں بجلی سی کوندھی۔

'' اوہو! اب سمجھا! سیٹھ سُکھ چین! وہ غالب پر کڑکی (قرقی) لانے والے ہیں۔ ہیں نہ؟''

نواب جان نے اُس کی طرف زہر آلودہ نظروں سے دیکھا۔ اور کوئی جواب نہیں دیا۔ نواب جان کی گستاخی کوتوال کو اچھی نہیں لگی۔

8

دلّی کے ایک سنسان علاقے میں شہر سے تھوڑی دور کیکر کے پیڑ اور امرائیوں سے ہوتے ہوئے ایک ایکہ درگاہ کی جانب جارہا تھا۔ ایکے میں اکیلی نواب جان۔ ایکہ کے پیچھے پردہ لگا ہوا تھا۔

درگاہ کے باہر چہل پہل تھی۔ پھول والوں کی۔ تبرک بیچنے والوں اور بساطیوں کے کھوکھے لگے تھے۔ مرزا غالب ایک دُکاندار سے چادر خرید کر آرہے تھے کہ اُن کے پاس ہی نواب جان کا پردہ دار ایکہ رُکا۔ پردے کے پیچھے سے آواز آئی۔

"مرزا!"

غالب رُک گئے اور ایکہ کی طرف دیکھا۔ نواب جان ایکہ سے اُتریں۔

"آداب عرض کرتی ہوں مرزا۔"

غالب نے نواب جان کو پہچانا۔

"آپ تشریف نہ لائے ہمارے کوٹھے پر..... بہت راہ دیکھی آپ کی......ہماری مہندی بھی پھیکی پڑ گئی .... دیکھیے نا!

سچ مچ مہندی پھیکی پڑ گئی تھی۔ نواب جان نے ہاتھ بڑھا کر دکھائے۔ غالب نے دیکھا۔ ایک ہتھیلی پر مہندی سے 'مرزا' لکھا گیا تھا۔ دوسری ہتھیلی پر 'غالب'۔ مرزا نے آہ بھری۔

"دیکھا آپ نے! بیچاری کا رنگ اُڑ گیا ہے؟"

غالب اُسے دیکھتے رہے۔ کہا کچھ بھی نہیں۔

"دیکھیے نہ زرد پڑ گئی ہے۔"

غالب ذرا رُکے پھر کہا۔

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

نواب جان بُت کی مانند کھڑی رہی جیسے اِس شعر کے تصور کو اوڑھ لینا چاہتی ہو۔

" واہ ! کس کس شعر پہ سر دُھنوں۔ کس کس شعر پہ جان دُوں۔"

غالب نے اپنی کیفیت بیان کی تھی، وہ خاموش رہے۔

"یہاں کیسے؟ میں نے سُنا تھا کہ آپ ......"

" چدّر چڑھانے آیا ہوں نواب جان......"

پہلی بار مرزا کے مُنہ سے اپنا نام سُن کر نواب جان مخمور ہو گئیں۔ ......

" اللہ!"

"کسی آنے والے کی زندگی کے لیے دُعا کر رہا ہوں۔...... اور تم؟"

نواب جان کے لہجے میں ایک اِشارہ تھا۔ اُس نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی۔

" میں بھی کسی کی کامیابی کے لیے دُعا مانگنے آئی تھی۔"

غالب نے آہ بھری اور کہا۔

"آہ کو چاہیے اِک عُمر اثر ہونے تک"

نواب جان سُنتی رہی۔ سر دُھنتی رہی۔ پھر ایک یقین سے کہا۔

"میرے اولیا نے آج تک میری ہر دُعا قُبول کی ہے۔ یہ بھی کریں گے ..... دیکھیے گا..... کسی روز میرے شاعر دلّی کے سرتاج شاعر ہُوں گے۔"

"تمہاری دُعا قُبول ہوئی تو ایک دوشالہ تمھیں ضرور پیش کریں گے۔ تمہارے گھر آ کر....."

نواب جان کا گلا بھر آیا۔

" میرے غریب خانے پہ آئیں گے آپ؟ ایک بار! صرف ایک بار مرزا !"

نواب جان کی بھیگی آنکھوں نے مرزا کو دیکھا۔

" آؤں گا ..... ضرور آؤں گا۔"

اولیا کی قبر پر مرزا نے چادر چڑھائی اور دُعا میں ہاتھ اُٹھ گئے۔

نواب جان نے پھول چڑھائے اور شکرانہ ادا کیا۔

عشق مُجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

باہر آ کر دونوں نے سیڑھیوں کو چھوا۔ مرزا نے اپنی راہ لی۔ نواب جان اُنہیں دیکھتیں رہیں۔

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

نواب جان اپنے ایکہ کی جانب بڑھی۔ ایکہ چل دیا۔

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق ۔ مصیبت ہی سہی

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

نوٗ

1

نواب جان موڑھے پر بیٹھی تھی اور ایک مُشاطہ اُس کے بال بنا رہی تھی۔ نواب جان ترنّم میں غزل گنگنا رہی تھی۔

کسی کو دے کے دِل، کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو

اچانک یہی دُھن سارنگی پر سُنائی دی۔ نواب جان جیسے سوتے میں جاگ گئی۔
"نمی چند آ گئے .....؟"
پھر اُس نے اپنے سارنگی نواز نمی چند کو آواز دی۔
"نمی چند!"
نمی چند کی سارنگی نے دیوان خانے سے جواب دیا۔ نواب جان مُسکرا پڑی۔
"جادُو ہے اِس آدمی کے ہاتھ میں۔"
مُشاطہ بھی مُسکرا دی اور پوچھا۔
"مرزا نے کیا کہا بی بی جی؟"
نواب جان نے دوسرا شعر گایا۔

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا اِمتحاں کیوں ہو

حاجی میر کے کُتب خانہ میں مرزا کوئی کتاب دیکھ رہے تھے کہ باہر شعر کا یہ حصہ سُنائی دیا۔
"عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا اِمتحان کیوں ہو"
حاجی میر نے مرزا کو دیکھا اور مرزا آنکھوں آنکھوں میں پوچھ بیٹھے۔

"یہ میرے اشعار کوٹھے تک کون پہنچاتا ہے؟"

"بھئی قدردان ہیں تمہارے۔ مُجھ سے مانگتے ہیں تو میں اِنکار نہیں کرتا۔ دِن میں کتنی بار تمہاری خیریت پوچھتے ہیں اور میں تمہاری رُوداد کہتے نہیں تھکتا۔"

اِس بیچ اگلا شعر سُنائی دیا۔

قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو

غالب نے کتاب بند کی اور جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ حاجی میر نے سوال کیا۔

"کہاں چلے؟"

"مجھے اپنے قدموں پہ زور نہیں۔ ڈرتا ہوں کسی ایسی راہ پہ نہ چل پڑوں، جہاں خود ہی اپنا رہزن ہو جاؤں .... خود ہی کو لُوٹ لوں؟"

غالب چلے گئے۔ وہ نکلے ہی تھے کہ فدن داخل ہوا۔

"آداب! نواب جان نے پوچھا ہے۔ کیا مرزا غالب آئے تھے یا آئیں گے؟ یا کوئی پیغام ہے اُن کا؟"

حاجی میر اُس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

اُوپر کوٹھے پر۔ نواب جان موڑھے پر بیٹھی تھی۔ مُشاطہ ابھی تک بال بنا رہی تھی۔ دیوان خانہ سے سارنگی کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ مُشاطہ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"مُجھے تو مرزا کُچھ ایسے وفا شعار نہیں لگتے۔"

نواب جان نے ایک اور شعر گایا۔

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

نواب جان کی آنکھیں بھر آئیں دیوان خانے سے نمی چند کی سارنگی نے ایک دردناک آلاپ چھیڑا۔

2

نانبائی کی دُکان کے باہر چند لوگوں کے ساتھ مرزا غالب بیٹھے تھے۔ بھولا اُنہیں نئی موجڑی پہنا رہا تھا۔ بھولا بہت باتونی ہے۔

"اجی بہُت پوچھا۔ کوئی ہمارے اسد بھیا کا گھر بتا دو۔ آگرہ میں بہت جوتیاں پہنائی ہیں اُنہیں۔ مگر کوئی خُدا کا بندہ ......"

"خُدا کے بندوں سے ہمارا کیا سروکار، بھولے ناتھ؟ کسی میخانے سے پتہ کیا ہوتا ــــــــ اور اسد نہیں، دِلّی میں غالب کے نام سے بدنام ہُوں۔"

دوسرا گاہک جو ایک موجڑی پہننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے ناراضگی جتائی۔

" ارے بھائی! یہ تو بہُت کاٹتی ہے۔"

"اب حضرت! اُس کے مُنہ میں پاؤں ڈالیں گے تو کاٹے گی نہیں تو کیا کرے گی؟

"بڑے بدتمیز ہو میاں ؟"

غالب نے بیچ بچاؤ کیا۔

" بُرا نہ مانیے، جناب! ذرا مُنہ لگا موچی ہے۔ لیکن جوتیاں اچھی بناتا ہے۔"

بھولا نے تائید کی اپنی تعریف میں ہی سہی۔

"اور یوں بھی صاحب۔ دِلّی میں آگرہ کی جُوتی چلتی ہے۔ کیوں اسد بھیا؟

"ہاں بس ......جُوتی ہی چلتی ہے۔"

غالب کے پیچھے سے کسی نے اُن کے کُہنی ماری۔

"مرزا ! .... آ رہے ہیں!"

غالب نے اُس کی طرف دیکھا۔

"کون آ رہے ہیں بھئی؟"

'' اُستاد ذوق آ رہے ہیں ...... پالکی میں ......''

اُستاد ذوق کی پالکی مرزا کے پاس سے گزری۔ اُن کے ملازم پالکی کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ غالب نے پالکی دیکھ کر طنز کیا۔

'' ہُوا ہے شہ کا مصاحب ، پھرے ہے اِتراتا''

غالب کے پاس کھڑے دو ایک اشخاص نے داد دی۔

'' واہ واہ مرزا ! مکرّر ۔ اِرشاد فرمائیے۔''

''ہُوا ہے شہ کا مصاحب ، پھرے ہے اِتراتا ......''

پاس کھڑے لوگوں نے مصرع دوہرایا۔ بھولا اپنی دُکانداری میں مصروف تھا۔ اُس نے پوچھا۔

'' یہ ذوق ہے !''

3

استاد ذوق اپنی حویلی میں اپنے شاگردوں سے گھرے تھے اور غالب کی فقرہ بازی پر ناراض تھے۔ شاگرد اپنے اپنے انداز میں ناراضگی جتا رہے تھے۔

''ارے صاحب! خُود تو شاہوں کی صحبت کے قابل نہیں۔ اور اُستاد پہ جُملے اُچھالتے ہیں۔''

'' نہایت اوچھی حرکت کی ہے مرزا نے!''

'' یاد نہیں۔ جب مُشاعرے سے دُم دبا کر بھاگ گئے تھے۔''

'' آتی جمعرات مُشاعرہ ہے .....''

شاگرد نے اُستاد کو رائے دی۔

'' .....بُلوا لیجیے قلعہ میں۔ مٹّی پلید کر کے بھیجیں گے۔''

دُوسرے نے کہا۔

'' اماں! وہ کیوں آنے لگے قلعے میں۔ کیا جانتے نہیں کہ ولی عہد کھڑے کھڑے محفل سے نِکلوا دیں گے۔''

ذوق اب تک صرف سُن رہے تھے چپ چاپ۔ پھر سوچ کر حُکم سنایا۔

'' تم دعوت نامہ بھیج دو ......''

پھر ایک اور شاگرد یاس سے مخاطب ہوئے۔

'' اور سنو یاس ! تم بہادر شاہ ظفر سے اِس واقعہ کا ذکر ضرور کر دینا۔''

4

دلّی کی ایک سُنسان سی سڑک پر ایکہ والا ایک فرنگی سے جھگڑ رہا تھا۔ کوچواں بدّو میاں تھے جو آگرہ سے آئے تھے اور فرنگی ولیم فریزر تھا۔ اُس کی بیوی بھی ساتھ تھی۔ بدّو میاں سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''ارے صاحب! آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ ہم کسی چرچ، پرچ کو نہیں جانتے۔ ہم نہیں جائیں گے۔''

ولیم فریزر نے سمجھانے کی کوشش کی۔

'' چرچ means گرجا۔ گرجا''

'' ارے بھئی گرجا یا اُٹھ جا۔ ہمیں کیا لینا ہے اُس سے؟ ہم تھکے ہوئے ہیں۔ ہم دو گھڑی آرام کریں گے سرائے میں۔''

اِس بیچ آس پاس کچھ لوگ کھڑے ہو گئے۔ اُن میں ایک مولوی صاحب بھی تھے۔ فریزر نے مولوی صاحب کو سمجھایا۔

''مولوائی ساب (مولوی صاحب) تم اِس کو سمجھاؤ ہم اور ہمارا فیملی چرچ میں جانا مانگٹا (مانگتا)۔ اُس کو بولو ...چلو... چلنا مانگٹا۔''

بدّو میاں بگڑ گئے۔

''ارے زبردستی ہے کوئی؟ مولوی صاحب اِس سے کہیے۔ چوراہے تک چلا جائے اور وہاں سے دوسرا تانگہ لے لے۔ ہم کل کے نکلے ہیں آگرہ سے۔ اور اب جا کے دِلّی پہنچے ہیں۔ ہم تھکے ہوئے ہیں اور ہم سے زیادہ ہمارا گھوڑا تھکا ہوا ہے۔ وہ اور نہیں چل سکتا۔

مولوی فرنگی کو بڑا افسر جان کر بدّو میاں کو سمجھانے لگے۔

''ارے بھئی کوچوان! یہ فرنگی ہے۔ خواہ مخواہ جھمیلا کھڑا کرے گا۔''

'' تو اِنگلستان میں جا کر جھمیلا کھڑا کرے۔ یہاں کیا لینا دینا ہے اِسے۔ یہاں کوئی اس کے باپ کی حکومت ہے۔''

فریزر اُردو جانتا تھا۔ پہلے ہی سے آگرہ کا لہجہ اور مقامی بولی ٹھولی اُس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوچوان بڑا بدتمیز ہے۔ حکم عدُولی کر رہا ہے اور کمپنی بہادر کی شان کے خلاف بات کرتا ہے۔ فریزر نے چھڑی ایکہ پر ماری۔

''کس کا باپ بولتا تُم۔ ٹومارا باپ .....؟''

فریزر کی بیوی یہ دیکھ کر گھبرا گئی۔

'' ڈارلنگ ... ڈارلنگ .....''

بدّو میاں اب آپے سے باہر ہو گئے۔ اُس نے فریزر کی چھڑی پکڑ لی۔ چھڑی کے دو ٹکڑے کیے اور فریزر کو دھکا دیا۔ فریزر نے دھمکی کے انداز میں کہا۔

'' تُم جانتا ہم ولیم فریزر ہے۔''

مولوی صاحب نے بدّو میاں کو سمجھایا۔

'' تم بھاگ لو یہاں سے۔ خوامخواہ دنگا ہو جائے گا۔ فرنگیوں کے ساتھ ......''

بدّو میاں کہاں ماننے والا تھا۔

'' ہو جائے۔ سالے لِکتی کے ہیں۔ بھون کے رکھ دیں گے۔''

'' بات مت بڑھاؤ اِس وقت۔ نکل جاؤ.....''

فریزر کی بیوی سہمی ہوئی تھی۔ فریزر بھی آپے سے باہر تھا۔ دو چار نے فریزر کو پکڑ رکھا تھا تا کہ معاملہ بگڑ نہ جائے۔

'' چوڑ دو (چھوڑ دو) چوڑ کے۔ باسٹرڈ۔ ہم ڈیکھے گا اُس کو....''

فریزر کی بیوی ڈر کے مارے کانپ رہی تھی۔ کچھ سر پھرے نوجوان طیش میں آگے بڑھ آئے۔

''لے چلو مسجد میں۔ سالے کو کلمہ پڑھواتے ہیں۔''

''لے چلو۔ اہلِ سُنت میں شامل کر لیتے ہیں۔''

اب بدّو میاں سمجھ گیا کہ معاملہ بگڑ رہا ہے۔ بدّو میاں ماحول کی نزاکت دیکھ کر بولے۔

''مولوی صاحب۔ مرزا نوشہ کے ہاں لالہ بنسی دھر آئے ہیں۔ اُن کو خبر پہنچا دیجیے گا۔

''بے فِکر رہو۔ وہ ہم دیکھ لیں گے۔''

بدّو میاں ایکہ ہانک کر سرائے کی طرف چلا گیا۔

5

مرزا غالب بنسی دھر کے ساتھ چھت پر بیٹھے تھے اور اُن کے ہاتھ میں قلعہ کے مشاعرے کا دعوت نامہ تھا۔ غالب نے دوست کے آنے کا شکریہ ادا کیا۔

''بھئی جب آتے ہو۔ اچھا شگن لے کے آتے ہو۔ یہ دیکھو 'باشا' کا دعوت نامہ۔ اُستاد نے بجھوایا ہے۔''

''مبارک ہو۔ میں جانتا تھا۔ آخر ..... کب تک بکرے کی ماں خیر منائے گی۔''

دونوں دوستوں نے ہاتھ ملائے۔ غالب نے رازدارانہ انداز میں بنسی دھر سے پوچھا۔

''اچھا یہ بتاؤ۔ اُستاد اور بادشاہ میں بکرا کون ہے اور ماں کون؟''

دونوں ہنس پڑے۔ بلّی کے بچے نے اُوپر کی طرف دیکھا۔ وہ طشتری میں پڑا دودھ چاٹ رہا تھا۔ بنسی دھر نے دوست کو تاکید کی۔

''پھر بھی محتاط رہنا۔ اُستاد ذوق دربار میں تمہارے پاؤں نہیں جمنے دیں گے۔''

غالب نے اپنے انداز میں پیشین گوئی کی۔

''ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں۔''

6

"ہم مشکور ہیں اُن تمام شعراء اور اُن سُخن ور حضرات کے جو آج کے مشاعرے میں شریک ہو رہے ہیں۔
لیکن مشاعرہ کے افتتاح سے پہلے ہم ایک بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ کچھ شعراء حضرات شاید ہمارے اُستاد شیخ ابراہیم ذوق سے نالاں ہیں اور سرِ راہ اُن پر جملے کستے ہیں جو اُن کے اپنے وقار کو زیب نہیں دیتا۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ ایسا نہ کریں اور آئندہ باہمی آداب و اِخلاق کی پابندی میں رہیں۔"

غالب سمجھ گئے کہ بات کِس کی ہو رہی ہے۔ لیکن شعراء میں سے آزردہ نے کہا۔

"ایسی گُستاخی ہم میں کوئی نہیں کر سکتا ہے حُضور!"

'یاس' موقعہ کی تلاش میں تھا۔ اُس نے سامنے آ کر غالب پر وار کیا۔

"مرزا نوشہ نے سرِ راہ اُستاد کی شان میں جُملہ کسا اور کہا ...."

یاس رُک گیا۔ محفل میں سناٹا چھا گیا۔ سبھی مرزا غالب کی طرف دیکھنے لگے۔ آزردہ نے پوچھا۔

"کیا کہا؟"

"ہُوا ہے شہ کا مُصاحب پھرے ہے اتراتا"

محفل میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ظفر نے سیدھے غالب سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"کیا یہ سچ ہے مرزا نوشہ؟"

غالب نے اِقبالِ جرم کیا۔

"جی حُضور! سچ ہے۔ میری غزل کے مقطع کا مصرعِ اُولیٰ ہے۔"

ناظرین چونکنے ہو گئے۔ آزردہ نے پوچھا۔

"مقطع ارشاد فرمائیں گے آپ؟"

غالب نے سر ہلا کر ہاں کر دی۔

"ہُوا ہے شہ کا مُصاحب پھرے ہے اتراتا"

غالب نے ابوظفر کی طرف دیکھ کر دہرایا۔

"ہُوا ہے شہ کا مُصاحب پھرے ہے اتراتا"

پھر ایک لمبی سانس لے کر شعر پورا کیا۔

"وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے"

اب یاس کے چونکنے کی باری تھی۔ آزردہ نے بے اختیار شعر کی داد دی۔

"واہ بہت خوب۔ بہت خوب مرزا!"

ظفر نے ذوق کی طرف دیکھا۔ ذوق نے بات آگے بڑھائی۔
"اگر مقطع اتنا خوبصورت ہے تو پوری غزل کیا ہوگی۔ سُنی جائے۔"
ظفر نے غالب سے گزارش کی۔
"مرزا۔ اگر زحمت نہ ہو تو پوری غزل سُنایئے۔ آج کے مشاعرہ کا آغاز اسی غزل سے کیا جائے۔"
راوی نے اعلان کر دیا۔
" شمع محفل مرزا اسداللہ خان غالب کے سامنے لائی جاتی ہے۔"
مرزا نے جیب ٹٹولی۔ کاغذ نکال کر اُنگلیوں میں رکھا اور ترنم سے اپنی غزل پیش کی۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

ناظرین نے واہ واہ کی۔ شعرا نے بھی اور خود ولی عہد ابوظفر نے بھی۔ غالب نے دوسرا شعر پیش کیا۔

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

مشاعرے میں نئی جان آ گئی چاروں طرف مرزا غالب کی واہ واہ ہونے لگی۔ خود ابوظفر بھی داد دیتے رہے۔ ذوق بھی اِس شعر پر داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔
مُفتی صدرالدین غالب کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے جھک کر غالب کے سامنے کاغذ پر لکھی غزل کو دیکھا۔ کاغذ بالکل کورا تھا۔ اُدھر ناظرین واہ واہ کر رہے تھے۔ 'مکرر مکرر' کی آوازیں آ رہی تھی۔
"رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل"

7

مرزا کے گھر کے باہر گلی میں۔ حافظ نے گاتے ہوئے شعر مکمل کیا۔
"جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے"

غزل سارے دِلّی شہر میں اُڑی۔ جگہ جگہ سے گونجی۔

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رَفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں ، دِل بھی جل گیا ہوگا...

8

نواب جان نے بھی یہیں سے آلاپ لیا اور مصرع اُٹھالیا۔

جلا ہے جسم جہاں ، دِل بھی جل گیا ہوگا
کرُیدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گُفتار اور اگر ہو بھی
تو کِس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

دَس

1

چنڈو خانہ اور وقت رات کا تھا۔ اندھیرا اور دھواں چاروں طرف۔ دو ایک نشہ خور اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ اوج، خورشید کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے گھٹنے پر دستک دی۔ بڑی مُشکل سے خورشید نے آنکھوں کے پٹ کھولے۔ اُس نے بڑی مُشکل سے اوج کو پہچانا۔

''ابے، تو پھر آ گیا .....ابھی تو گیا تھا۔''

''میں تو یہ پُوچھنا ہی بھول گیا تھا۔ کہ آج کون سا دِن ہے۔''

'' چہارشنبہ۔''

'' یعنی جمعرات''

'' ہوں .....''

'' تو مُشاعرہ کس روز تھا؟''

''کون سا؟ مرزا غالب کا؟''

''لو بیٹا! کہاں تو اُس آگرے والے کا نام لینا پسند نہیں تھا اور اب مُشاعرہ ہی اُس کے نام سے منسوب کر دیا۔

''اماں۔ اوج بھائی! .....کیا بتائیں۔ یاس مرزا نے قسم دِلوائی تھی کہ ایک لفظ مُنہ سے نہیں نکلے گا۔ لیکن بے اختیار مُنہ سے واہ نِکل گئی۔''

'' ہم نے ضبط تو بہُت کیا بھئی! پر کیا کرتے۔ جب اُستاد ذوق خود ہی تعریف پر تُل گئے تو ہم نے بھی..........''

اِس بیچ ایک اور نشہ خور اُن کی بات چیت میں شامل ہو گیا۔ نو آمد نشہ خور نے اوج کی جانگھ پر ہاتھ مارتے ہُوئے کہا۔

'' اوج بھائی اِسی بات پہ ہو جائے ایک چلم۔ اب تو غالب بھی دِلّی کے ہو گئے۔''

کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی ٹھیکے دار کے آدمی نے دو چلم بھیج دیے۔

2

ابوظفر کی بیٹھک میں۔ اُستاد ذوق ولی عہد کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ظفر نے غالب کا شعر دہرایا۔

''ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے''

ذوق مُسکرائے۔

'' شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے۔''

دونوں ہنس پڑے۔

'' یہ شعر اپنے ہی حال پہ کہا ہے مرزا نوشہ نے۔ دِلّی میں شاید ہی کوئی ایسا سُخن نواز ہوگا جو آج غالب کو نہ جانتا ہو۔''

'' صرف سُخن نواز ہی نہیں حضور والا۔ کوئی چوپڑباز۔ جُوئے باز۔ مےخور۔ سُودخور۔

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے ''

ظفر سوچ میں پڑ گئے۔

'' مرزا فخرو، ہمارے بڑے صاحب زادے نے، مرزا غالب کی شاگردی میں جانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔''

'' ہُوں۔''

پھر ذوق خاموش ہو گئے۔ ظفر نے اُستاد کی چُپی توڑی۔

'' آپ کیا مشورہ دیتے ہیں؟''

ذوق خاموش۔ ظفر نے پھر پوچھا۔

'' غالب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

ذوق نے پھر وہی شعر کا بند دوہرایا۔

'' .....شاعر تو وہ اچھا ہے پر ......''

ظفر نے ہنستے ہوئے مقطع پورا کیا۔

''...... پر بدنام بہت ہے!''

ہنسی تھوڑی دیر میں تھم گئی۔ ولی عہد نے بڑی سنجیدگی سے اُستاد کی رائے جاننی چاہی تھی۔ اُستاد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''شاہی خاندان میں اُٹھنے بیٹھنے کے لائق نہیں ہے ..... اور شہزادہ فخر وابھی جواں سال ہیں۔ اِس عمر میں جُوئے، شراب کی لت بڑی جلدی پکڑ لیتی ہے۔ شہر کا کوئی سُود خور نہیں جس سے مرزا نے قرض نہ لے رکھا ہو۔ کبھی نماز نہیں پڑھی۔ کوئی روزہ نہیں رکھتے۔ پُوچھو تو فرماتے ہیں۔''

جس پاس روزہ کھول کر، کھانے کو کُچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے، تو لاچار کیا کرے

لیکن ابوظفر نے کچھ اور ہی سُنا تھا۔

'' سُنا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیروکار ہیں۔ اُنہیں کا ایک شعر ہے۔''

کیا غم ہے اُس کو جس کا علی سا اِمام ہو
اِتنا بھی اے فلک زدہ کیوں بے حواس ہے

ذوق نے اپنی جانکاری دے دی۔

''شیعہ کب اور کیسے ہوئے، پتہ نہیں۔ کیونکہ اُن کے والدین اور ننہال کے لوگ تو سُنّی طریقے کے پابند تھے۔''

'' غالباً مُلاّ عبدالصمد کی صحبت کا دخل رہا ہوگا ۔ مرزا نے تیرہ چودہ برس کی عمر تک اُنہیں سے تعلیم حاصل کی..... پھر بھی میرا خیال ہے کسی شاعر کے شعروں سے اُس کے مذہبی اعتقاد کا اندازہ لگانا دُرست نہیں۔''

'' جی ہاں۔ اگر کوئی اعتقاد ہو!''

یہ اُستاد ذوق کی چوٹ تھی مرزا پر۔ لیکن جیسے ولی عہد نے دھیان ہی نہ دیا۔ وہ غالب کو یاد کر رہے تھے۔

''غالب نظر نہیں آئے اُس مُشاعرے کے بعد۔ میاں فخرو اُن سے بہت متاثر ہو گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پیغام بھیجا جائے اُن کے گھر۔''

ذوق نے آخری وار کیا۔

'' جی ہاں۔ لیکن پیغام کہاں بھیجئے گا؟ گھر پر یا کسی کوٹھے پر؟''

3

مرزا گھر ہی پہ تھے۔ گھر کا ماحول بدلا ہوا تھا۔ مہمان آئے تھے۔ شادیانہ تھا۔ عورتیں بھری ہوئی تھی۔ امراؤ کو گھیرے ہوئے۔

ڈھولک پر بچے کے آمد کی خوشی میں منگل گیت گائے جا رہے تھے۔ آگرے سے لالہ بنسی دھر اور لالائن بھی آئے تھے۔ مہمانوں کے بچے آنگن میں کھیل رہے تھے۔

مرزا غالب کے بچے کو مرزا جی جیسا چوغا اور ویسی ہی ٹوپی پہنائی گئی تھی۔ عورتیں ہنس رہی تھی اور ان میں وفادار بھی شامل تھی۔ ایک عورت نے بتایا۔

" یہ لباس لالہ بنسی دھر کے یہاں سے آیا ہے۔ لالائن نے اپنے ہاتھوں سے سیا ہے۔"

" کوئی ناپ تو تھا نہیں اپنے پاس۔ سو بھائی سوچ کے سی لائی۔"

" اُوپر لے جاؤ بھائی مردانے میں۔ بڑے مرزا کو دِکھالاؤ۔"

لالائن نے خوشی سے کہا۔

" ہاں ہاں دِکھالاؤ۔ کہنا اُن کے صاحب زادے بھی اُنہیں کی صورت لگتے ہیں۔"

ایک نے کہا۔

" صرف صورت تک ہی بھلی! سیرت پہ نہ جائیں تو اچھا ہے۔"

لالائن کو بُرا لگا، جھٹ کہا۔

" کیوں بھئی، سیرت میں کیا بُرائی ہے؟ ماشاءاللہ بہت بڑے شاعر ہیں۔ اب تو دِلّی میں بھی لوہا منوا لیا اپنا۔"

" امراؤ سے پُوچھو۔ وہ خوش ہے اِس سیرت سے۔"

" کیوں نہیں۔ مجھے بہت فخر ہے اُن کی ذات پر۔"

عورتیں ہنس پڑی۔ امراؤ بیگم نے وفادار سے کہا۔

" تو اُوپر لے جا چھوٹو کو۔"

اوپر والے کمرے میں مرزا، بنسی دھر اور دیگر دوست بیٹھے تھے۔ تفتہ بھی اُن میں شامل تھے۔ مرزا نے اپنے قاعدہ کے کچھ اشعار پڑھے۔

تیغ کا ہندی اگر تلوار ہے
فارسی پگڑی کی بھی دستار ہے

نیولا راسو ہے اور طاؤس مور
کبک کو ہندی میں کہتے ہیں چکور

دوستوں نے تعریف کی۔ مفتی صاحب نے صلاح دی۔
"واہ مرزا۔ اب تو بچّوں کے لیے دو چار قاعدے لکھ ڈالیے۔ وہ آپ کی زبان خوب سمجھیں گے۔"
"وہی سمجھیں گے۔ بڑوں سے تو بھر پائے۔"
قہقہوں اور ٹھہاکوں کے بیچ میں وفادار چھوٹو کو لے کر اوپر آ گئی اور اپنے تُتلاتے لہجے میں دروازے سے ہی پوچھا۔
"ہم اور چھوٹے میاں حاضل (حاضر) ہو سکتے ہیں۔"
"آئیے آئیے چھوٹے میاں۔ تشریف لائیے۔"
اپنا دُوپٹہ ٹھیک کر کے وفادار اندر داخل ہو گئی۔
"آداب بجالاتی ہوں۔ آداب کہیے چھوٹے میاں۔"
بنسی دھر بچّے کو دیکھ کر بولے۔
"ارے واہ۔ بالکل مرزا نوشہ ہی لگتے ہیں۔"
"تخلص بھی 'نوشہ' ہی رکھ دیجیے۔" تفتہ نے مذاق کیا۔
"ارے میاں۔ اِن کا قاعدہ سُنا دیجئے اِنہیں۔" ایک دوست نے یاد دلایا۔
غالب نے بچّے کو گود میں لیا اور پھر گھوڑا بن کر پیٹھ پر بٹھا لیا۔

اسپ جب ہندی میں گھوڑا نام پائے
تازیانہ کیوں نہ کوڑا نام پائے

چاہ کو ہندی میں کہتے ہیں کنواں
دُوْد کو ہندی میں کہتے ہیں دُھواں

آجُل اور آروغ کی ہندی ڈکار
مئے شراب اور پینے والا مئے گُسار

اچانک بچہ رو پڑا۔ غالب نے سمجھایا۔

'' ارے بھائی۔ شراب کے نام پہ ناراض ہو گئے تُم؟ آخر امراؤ کے بیٹے نکلے نا......؟ ہمارا کوئی اثر نہیں ہُوا تم پر۔''

وفادار نے آ کر بچّے کو اُٹھا لیا۔

''کیا ہُوا؟ کیوں رو رہے ہیں؟''

غالب نے معافی مانگی۔

'' کُچھ نہیں! اِن کے لیے ہندی، فارسی کا قاعدہ بنا رہے تھے۔ اِنہیں بات اچھی نہیں لگی۔''

'' اُردو سکھائیے نا۔ اُردو کا قاعدہ لِکھ دیجیے اِن کے لیے۔''

'' اُردو ہندی ایک ہی زبان ہے۔ صرف رسم الخط کا فرق ہے۔''

بنسی دھر بھی بول پڑے۔

'' اِنہیں ایک ہی زبان ماننا چاہیے۔ یہیں تو پیدا ہوئیں۔ ہندوستان میں۔''

'' اور کیا۔ لشکروں میں جو ملی جُلی زبان بولی جاتی تھی۔ وہی 'اُردو' کہلائی۔ اُردو کے معنی ہی لشکر کے ہیں۔'' تفتہ نے بھی اپنی معلومات دی۔

وفادار بچّے کو لے جاتے ہوئے بولی بچّے سے:

'' خُدا حافظ کہو۔''

وفادار جانے لگی تو مرزا غالب نے پوچھا۔

'' ارے اب کہاں لے جا رہی ہیں اِنہیں۔ قلم سیاہی سُونگھنے دو ذرا ......ارے باذوق لوگوں میں بیٹھیں گے تو کچھ...''

'' بیگم صاحبہ اِنہیں درگاہ پہ لے کے جا رہی ہیں۔''

'' ابھی سے؟''

'' بچے کے لیے ٹھکرانے کی چادر چڑھانی ہے نہ!''

وفادار بچّے کو لے کر نیچے چلی گئیں۔ غالب کو بھی کچھ یاد آیا۔

'' اوہو! ایک دوشالہ کا وعدہ ہم نے بھی کیا تھا۔''

مفتی صاحب نے پوچھا

'' واہ کس سے؟''

''یہ شہرت اُسی کی دُعاؤں کا نتیجہ ہے۔''

4

قلعے کے مشاعرے میں نہ صرف موقعہ ملا تھا بلکہ پورا مشاعرہ ہی لوٹ لیا مِرزا نے۔ اُن کی اِس کامیابی میں جن کی دُعائیں تھیں اُن کو وعدے کے مطابق گھر جا کر دوشالہ دینا تھا۔ بچّے کے جنم کو لے کر تھوڑی بہت پریشانی اور بڑھی مصروفیت کی وجہ سے دے نہیں پائے۔ آج یاد آیا تو دوشالہ اُٹھا کر نواب جان کے کوٹھے پر جا پہنچے۔ اُوپر آتے ہی لگا جیسے مکان سنسان ہو۔ باہر کا کمرہ خالی۔ دیوان خانہ خالی۔ اب لگا کہ مکان ہی خالی کر دیا گیا تھا۔ پھر کچھ کھٹکا ہوا۔ مِرزا نے دیکھا فدّن میاں کھڑے تھے۔ فدّن حیران۔

'' مِرزا نوشہ! تسلیم عرض کرتا ہوں۔''

غالب حیران تھے اور پریشان بھی اُنہوں نے پوچھا۔

'' نواب کہاں ہے۔ گھر بدل دیا کیا؟''

فدّن روہانسا تھا۔

''اپنی قسمت نہ بدل سکی حُضور!..... تو شہر بدل دیا۔''

''کیا ہُوا؟ اچانک دِلّی کیوں چھوڑ گییں؟''

''کوتوالِ شہر نے چند مہینوں سے جینا مُشکل کر دیا تھا۔ نواب جان کی زبان چلتی تھی۔ کوتوال کے ہاتھ پیر۔ ملکہ جان نے بہت سمجھایا نواب کو.....''

'' ملکہ جان کون؟''

'' نواب جان کی اّمی ! مگر نواب پر تو عشق کا جنوں سوار تھا۔ سچ کہوں مرزا۔ عشق نہیں وحشت لگتی تھی۔''
مرزا نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے قد آدم شیشہ تھا۔ اُس میں پہلے اپنی تصویر دکھائی دی۔ پھر کچھ لکھاوٹ نظر آئی۔ پاس آکر دیکھا ایک شعر ہی تھا۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

'' یہ نواب نے لکھا ہے؟''
'' لِکھا تو آپ کا ہے۔ لکھائی نواب کی ہے۔''
آج ایک درد اُنہیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا۔ نواب جان کے کھو جانے کا درد! فدّن نے پوچھا۔
''قبلہ! کیسے سب کا حالِ دِل کہہ لیتے ہیں آپ؟''
مرزا ایک اور دیوار کی طرف آگئے وہاں ایک اور شعر لکھا ہوا تھا۔ دبی آواز میں غالب نے پڑھا۔

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کُچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

غالب نے دیکھا فدّن پاس ہی کھڑا تھا۔
'' ہمیں دیر ہوگئی، فدّن! نواب کا قرض رہ گیا ہم پر.....''
مرزا دروازہ کی طرف مڑے۔ ایک کواڑ ادھ کھُلا تھا۔ اُسے کھول دیا۔ کواڑ کے پیچھے ایک اور شعر لِکھا تھا اس شعر کو بھی دبی آواز میں پڑھا۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

غالب کو بڑا پچھتاوا ہوُا۔ اُنہیں اُس کے پاس جانا چاہیئے تھا۔ کتنی راہ دیکھی ہوگی اُس نے کِتنے پیغام بھیجے تھے اِس فدّن میاں کے ہاتھ کِتنی پوچھ تاچھ کھوج خبر کی تھی حاجی میر سے۔ مرزا نے فدّن سے پوچھا۔
'' کتنے سال رہے نواب جان کے ساتھ فدّن میاں؟''
فدّن نے کچھ یاد کر کے کہا۔

''بچپن سے.....نواب کے بچپن سے۔''

فدّن دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑے ہو گئے۔

''ملکہ جان کی جوانی سے ساتھ ہوں۔''

مرزا نے فدّن کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کتنے سال ہوئے؟''

فدّن کیا حساب کرتے؟ کہہ دیا۔

''بے حساب!''

غالب نے سوال کیا۔

''تو ساتھ کیوں نہیں گئے؟''

فدّن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پہلی بار اپنے زخم کھول کر دکھا دیئے۔

''بتا کے نہیں گئیں!''

غالب نے آہ بھری اور ایک شعر کہا۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اور تیزی سے سیڑھیاں اُتر گئے۔

5

وہ رات بہت بھیگی اور اُداس رات تھی۔ بیچ بیچ میں پانی برستا۔ غالب اپنے پڑھنے کے کمرے میں خط لکھ رہے تھے۔ بہت ساری چٹھیاں لکھی تھیں۔ یہ چٹھیاں اُنہوں نے اپنے دوستوں۔ مہربانوں۔ قدردانوں اپنے چاہنے والوں اور اپنے شاگردوں کو لکھی تھیں۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

نکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہوکر ترے کُوچے سے ہم نکلے

خُدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اُٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافِر صنم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اِتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

پاس ہی دروازے پر بلّی کا بچہ سو رہا تھا۔ مرزا اُٹھے اُس کو اندر لے آئے۔ بلّی مری پڑی تھی۔ اُنھیں ایک جھٹکا سا لگا۔ اور اُنہوں نے بلّی پر لکھا اپنا فارسی زبان کا شعر پڑھ دِیا۔

گیارہ

1
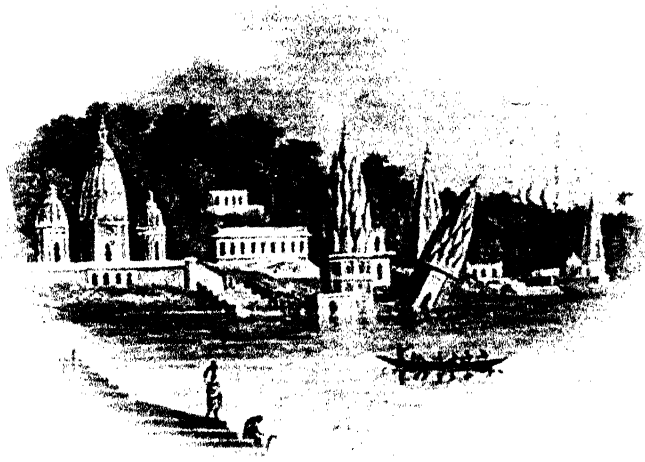
بنیے کی دُکان سے وفادار سامان خریدنے آئی تھی۔ سامان باندھ کر جھلی میں رکھا جا رہا تھا۔ بنیے نے مسُور کی دال تولی اور کاغذ کے تھیلے میں ڈال دی۔ وفادار کو کچھ کھٹکا۔ اُس نے بنیے سے پوچھا اپنی تُتلاتی زبان میں۔

'' مسُول کی ڈال کِتی (مسُور کی دال کتنی) ڈالی؟ یہ تو کم لگتی ہے۔''

'' کم نہیں تُلتا یہاں۔ تین سیر ہے!''

'' پر ہم نے پان سیر مانگی تھی۔''

'' مانگنے سے ہی تو سب مِل نہیں جاتا بی بی! ہمیں بھی پیسے مانگتے کِتے مہینے ہو گئے؟''

'' پر گھر میں مہمان آئے ہیں بھائی! اِتے میں کیسے پورا ہوگا؟''

'' جو مِلا ہے اُٹھا لو بی بی! انٹی میں کوڑی نہیں اور دعوتیں روز کرتے ہیں مرزا! بس اُن کا مُنہ دیکھ کر کچھ کہتے نہیں۔ ورنہ......''

وفادار کو سُن کر بہت بُرا لگا اور اُس نے دوٹوک جواب دیا۔

'' تو دے دیں گے۔ اِتّی (اِتنی) باتیں مت سُناؤ ہمارے حُضور والا کے لیے۔''

اور بھی گاہک کھڑے تھے۔ اُن کے سامنے ایک نوکرانی نے اُسے چُپ کرا دیا۔ بنیے نے بات بدلی۔

'' بڑی وفادار ہو مرزا کی؟''

ایک گاہک جو پاس میں کھڑا تھا۔ بولا:

'' ہاں بھئی وفادار تو ہیں۔ نام بھی تو وفادار ہے۔''

'' ارے صاحب! شہرت تو فلک کو چھونے لگی ہے۔ سارے شہر میں چرچا رہتا ہے .....اور پیسے دھیلے کا کوئی ذکر نہیں۔''

'' شہرت سے پیسا تھوڑا ہی آجاتا ہے میاں!''

'' مسُور کی دال بھی نہیں آتی۔''

پھر وفادار سے مُخاطب ہُوا۔

" چلو اُٹھاؤ بی بی!"

سارا سامان اُٹھوا کر۔ جھلّی والے کو لے کر وفادار چلدی۔

وفادار سارا سامان لے کر اپنی گلی کے نکڑ پر پہنچی تو سُورداس گاتا ہوا دِکھائی دیا۔ بھجن سُن کر وفادار کچھ ٹھہری۔

" بابا کیا ہوا؟ دو منگل سے اِس تلف (طرف) آئے نہیں آٹا لینے!"

" ہماری پتنی مائیکے گئی رہی بٹیا! تب ہی نہیں آئے سکے۔"

" تو پھل (پھر) اگلے منگل ضلول (ضرور) آؤ، بابا!"

" ہاں بٹی جیتی رہو۔"

سُورداس گاتا ہُوا آگے چل دیا۔ وفادار سودا سُلف لے کر گھر کی طرف بڑھ چلی۔ جھلّی والا پیچھے پیچھے۔

2

اگلی گلی کے نکڑ پر بچے کھیل رہے تھے۔ وہ ایک نیم پاگل آدمی کو ٹوپ پہنا کر گورا فرنگی بنا رہے تھے۔ کہیں سے گندی سی سولر ہیٹ (solar hat) مل گئی تھی۔ اُس ہیٹ میں رنگین پنکھ لگایا اور گدھے پر بٹھایا۔ اِتنے میں وفادار جھلّی والے کو لے کر سامنے سے گُزر گئی۔ بچوں نے ہیٹ والے کے ہاتھ میں ایک چھڑی بھی تھمادی تھی۔ پھر اُس کو لے کر گھمانے لگے۔ اور چلا چلا کر گانے لگے۔

" اِلّا پلّا پالا ہو

گورے کا مُنہ کالا ہو۔"

ایک بچے نے مرزا کو آتے ہُوئے دیکھ لیا۔

" ارے بھاگ لو ...... بھاگ لو۔ مرزا جی آرہے ہیں۔"

لڑکے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اُن کو بھاگتے دیکھ گدھے نے دولتی جھاڑی۔ گدھا سوار زمین پر آگرا۔

مرزا نے بڑھ کے گرے ہوئے آدمی کو اُٹھایا۔ اب مرزا کی نظر اُس کے چہرے پر پڑی تو چونک کے رہ گئے۔

"یوسف! تم کب آئے یوسف میاں؟"

یوسف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ مرزا کو پہچانا۔ اُس کی نظر ڈھول میں گری سولر ہیٹ پہ تھی۔ اس نے ہیٹ اٹھا کر پھر پہن لیا۔ مرزا نے غصّے میں ہیٹ اُٹھا کر پھینک دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟ ہٹاؤ اِسے!"

لیکن یوسف کا سارا دھیان ہیٹ پر تھا۔ وہ ٹوپ کی طرف چل پڑا۔ مرزا نے ڈانٹا۔

"یوسف میاں! اِدھر آؤ۔"

یوسف اب ڈرتے ڈرتے مرزا کی طرف آ گیا۔

"چلو۔ گھر چلو۔"

اور اُسے لے کر وہ گھر کی طرف بڑھے۔

مرزا یوسف کو لے کر گھر میں داخل ہوئے تو دروازے پر کلو میاں مل گئے۔

"یوسف کب آئے؟"

"آج صبح ہی پہنچ گئے تھے حضور! بھاوج بچے سب آ گئے ہیں آگرہ سے۔"

"باہر کیوں نکلنے دیا انہیں؟ تم جانتے ہو اِن کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے۔"

کلو میاں نے شرمندگی سے جواب دیا۔

"روٹی کھا رہے تھے حضور پتہ نہیں کب تھالی اُٹھا کے باہر آ گئے...... یہ دیکھئے نہ تھالی...."

مرزا نے تھالی اُٹھائی اور کلو میاں کو پکڑا دی۔ اور کلو سے مُخاطب ہُوئے۔

"سُنو! مسجد کے پچھواڑے میں جو خاں صاحب ہیں ..... یوسف میاں کے رہنے کا انتظام کرا دو وہاں..... اور میرا کلکتہ جانے کا انتظام کرو۔ چلو یوسف۔"

3

کاغذوں کا پلندہ حاجی میر صاحب کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اور درخواست کی۔

''میر صاحب! یہ سارا کلام ہے میرا، جواب تک جمع ہوا ہے۔ یہ اپنے پاس رکھ لیجیے۔''

میر صاحب نے مرزا کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں 'کیوں' ؟

'' گروی رکھ لیجیے .... اور مجھے کلکتہ تک کے سفر کے لیے کچھ دام دیجیے۔ کلکتہ گئے بغیر میرا پنشن کا معاملہ نپٹے گا نہیں، میر صاحب! خود ہی جا کے جنرل مٹکاف صاحب سے ملوں گا۔''

کچھ دیر کے بعد خاموشی توڑتے ہوئے میر صاحب نے سمجھایا۔

'' مرزا ! مجھے گنہگار نہ بناؤ۔ یہ دیوان تو میں گروی رکھنے سے رہا ..... اور اتنا میرے پاس ہے بھی نہیں کہ کلکتے تک کے اخراجات مہیا کر پاؤں......''

مرزا نے اُس کی طرف دیکھا۔ میر صاحب نے بات جاری رکھی۔

'' ..... ہاں لکھنؤ تک کا انتظام میں کیے دیتا ہوں اور وہاں دو ایک واقف کار ہیں۔ شاید وہ نواب پاشا غازی الدین حیدر تک پہنچا دیں۔ ......ورنہ ...... ویسے سُنا ہے۔ چلتی وہاں بھی کمپنی بہادر کی ہے۔ نائب السلطنت آغا میر انگریزوں کے ہاتھ بک چکے ہیں۔''

'' بتائیے! اودھ اُدھر، دلّی یہاں۔ بادشاہ (بادشاہ) قلعے میں۔ حکومت کلکتہ میں..... جناب کمپنی بہادر اور کہیں ......کہیں کوئی شہر بک رہا ہے..... کہیں کوئی ریاست بک رہی ہے....... کہیں فوجوں کی ٹکڑیاں خریدی جا رہی ہیں۔ بیچی جا رہی ہیں۔..... یہ کیسے سوداگر آئے ہیں اِس مُلک میں...... سارا مُلک پنساری کی دُکان بن گیا ہے۔''

مرزا غالب کے لہجے میں کافی تلخی آ گئی ہے۔

'' معلوم نہ تھا اتنا کچھ ہے گھر میں بیچنے کے لیے...... زمین سے لے کر ضمیر تک سب کچھ بک رہا ہے۔ سب بکتا جا رہا ہے۔''

مرزا غصے میں تھے کچھ اپنے اُوپر کچھ زمانے پر۔ میر صاحب اُنہیں حقیقت کی زمین پر کھینچ لائے۔

''سُنا ہے باشا (بادشاہ) اکبر ثانی سخت بیمار ہیں۔ اور شاید ولی عہد ابوظفر جلد ہی بادشاہ ہو جائیں۔''

'' ہوں..... اُن کے باشاہ ہونے سے کیا کسی انقلاب کی اُمید رکھتے ہیں آپ؟''

'' شاید اُن کا نظریہ الگ ہو!''

'' بادشاہت کے نظریے اور رویّے ہمیشہ سے خاندانی رہے ہیں ہمارے یہاں۔''

'' جی ہاں......ہم لوگ بڑی آسانی سے خاندانوں کے غُلام ہو جاتے ہیں۔......پھر بھی...... اِس نا اُمیدی میں شاید ظفر کام آ جائیں۔''

4

مرزا غالب گھوڑے پر سوار تھے۔ علاقہ جنگل کا تھا۔ اُن کے پیچھے ایک دو ملازم سامان لیے ہوئے گھوڑوں پر۔ غالب کی پیشانی میں کچھ اشعار جھنجھنا رہے تھے:

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کُھلتا، یعنی
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف وطوافِ حرم ہے ہم کو

لئے جاتی ہے کہیں ایک توقّع غالب
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

5

لکھنؤ کی ایک سرائے میں مرزا غالب مقیم ہوئے۔ جاڑے کا موسم تھا۔ وقت رات کا۔ مرزا آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ پاس تپائی پر کچھ دوائیوں کی بوتلیں اور پڑیوں میں سفوف۔ مرزا نے ایک پڑیا اُٹھا کر کھولی اور پانی کا لوٹا اُٹھالیا کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔ کسی نے اجازت چاہی۔

" ہم خدمت میں حاضر ہوسکتے ہیں مرزا صاحب؟"

مرزا نے ہاتھ کے اِشارہ سے بُلایا۔ سفوف مُنہ میں ڈالا اوپر سے پانی پیا۔ اِس بیچ دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ بسمل اور عاشق تھے۔ حاجی میر کے دو واقف کار۔ بسمل نے آگے بڑھ کر آداب کیا۔

" آداب عرض کرتا ہوں حضور والا۔"

مرزا نے ہاتھ کے اشارے سے آداب کا جواب دیا۔ بسمل اور عاشق میاں کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ دونوں پاس آ کر بیٹھ گئے۔

" کچھ افاقہ ہوا طبیعت میں؟" بسمل نے خیریت دریافت کی۔

غالب نے دوا پی لی تھی۔

" ہوں..... اور کچھ روز ابھی ......"

عاشق نے اِصرار کے لہجے میں کہا۔

" آپ اِس سرائے میں جانے کیوں پڑے ہیں؟ دو ماہ ہوگئے۔ ہمارے غریب خانے پہ تشریف لے چلیے۔"

" دیکھو بھائی عاشق علی! اِتنے دوست ہیں لکھنؤ میں۔ ایک کے ہاں ٹھہروں تو دوسرا ناراض ہوجائے۔ اِس لیے اچھا ہے، یہیں رہوں سرائے میں۔"

" اِس ناچیز کو خدمت بجالانے کا موقعہ دیجیے۔"

" دوست کو موقعہ دُوں خدمت کرنے کا، تو خود کو بیمار رکھنا ضروری ہوجائے۔ میں صحت مند رہوں تو کیا بُرا لگے گا تمھیں؟"

بسمل نے کہا۔

" آپ تو ......بس لاجواب کر دیتے ہیں ...... حاجی میر سمجھیں گے ہم نے خیال نہیں رکھا آپ کا....."

" یہی بہت ہے کہ آپ صاحبان نواب حیدر سے مِلا دیں ایک بار....."

عاشق علی نے ایک اور ترکیب سمجھائی۔

" آپ اگر نائب السلطنت کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ دیں تو۔"

غالب بگڑ کر بولے۔

" اُس خانساماں کی تعریف میں...... جو انگریزوں کی مدد سے وزیر بن گیا ہے۔اور ابھی تک بنا ہُوا ہے۔"

" مجبوری ہے ...... اور غرض بھی ہماری ہے قبلہ..... ایک بار اگر آغا میر سے مُلاقات ہو جائے تو......"

بسمل نے سمجھایا۔

غالب بہت بگڑ گئے۔اُنہوں نے مُلاقات کے لیے اپنی شرطیں رکھیں۔

" مُلاقات کی بھی دو شرطیں ہیں۔اوّل تو یہ کہ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر ہمیں تعظیم دے گا۔اور دوئم یہ کہ میں کوئی نذرانہ،نہ دُوں گا۔"

عاشق علی اور میاں بسمل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

" نذرانے کے لیے تو ہم اُن سے کہہ دیں گے۔ لیکن ......"

" باقی شاید ممکن نہ ہو" عاشق علی نے بات پُوری کی۔

" تو یہ بھی ممکن نہ ہوگا حضرات کہ میں......"

عاشق اور بسمل حیران ہوئے کہ کیا کِیا جائے۔

" آج شام اُن کے نائب سے ملاقات ہوگی تو ہم......"

غالب چڑ گئے......

" نائب کے نائب سے .....؟ ٹھیک ہے کل خبر کیجیے گا۔"

دونوں کھڑے ہو گئے۔

" اِجازت دیجیے۔"

دونوں نے جھک کر آداب کیا۔ باہر چلے گئے۔

6

اُسی سرائے میں دن کے وقت۔ مرزا دیوان پر بیٹھے تھے۔ کندھوں پر کمبل پڑا ہوا تھا۔ بہت سارے لوگ جمع تھے۔ ایک شخص نے کہا۔

" یہ تو نہیں کہہ سکتے آپ؟ دلّی اور لکھنؤ کی اُردو میں فرق تو ہے۔"

" مثلاً رتھ کو آپ مذکر مانیں گے یا مؤنث؟" دوسرے شخص نے پوچھا۔

" لفظ میرا قلم صحیح ہے یا میری قلم۔ لکھنؤ والے میرا قلم کہتے ہیں۔"

" عورت لکھے تو میری۔ مرد لکھے تو میرا !" غالب نے جواب دیا۔

سبھی ہنس پڑے۔ پہلے شخص نے پھر سوال کیا۔

" جُوتا؟ ..... جُوتی؟...."

دُوسرے شخص نے کہا۔

" مرزا تو وہی کہیں گے۔ عورت پہنے تو جُوتی۔ مرد پہنے تو جُوتا۔"

" جی نہیں۔ زور سے پڑے تو جُوتا۔ ہلکی پڑے تو جُوتی!"

ایک ٹھہاکہ پڑا۔ پھر غالب کچھ سنجیدہ ہو گئے۔

" دیکھئے حضرات۔ ہندوستان میں ہر پچیس کوس پر لوگوں کی بولی بدل جاتی ہے۔ اِس لیے دو جگہوں کی زبان میں فرق آ جائے تو جائز ہے۔ لیکن لوگوں میں فرق آ جائے تو جائز نہیں ہے۔ زبان الگ ہونے سے لوگ الگ نہیں ہو جاتے۔ دُشمن نہیں ہو جاتے۔ لکھنؤ اور دلّی کی زبان میں اگر فرق ہے تو ہے۔ وہ ایک دوسرے کے بیری تو نہیں ہیں۔"

مجلس میں خاموشی چھا گئی۔ غالب نے پھر کہا۔

" میر آئے تھے لکھنؤ...... میر تقی میر۔ آپ نے قدر نہ کی اُن کی۔ مایوس ہو کر چلے گئے لکھنؤ سے ..... گھاٹا کس کا ہُوا ؟"

کُچھ وقفہ خاموشی کا۔ پھر عاشق علی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دھیرے دھیرے اور لوگوں نے بھی اُٹھنا شروع کیا۔

" اجازت دیجئے مرزا۔"

''خُدا حافظ۔''

'' ایک بات عرض کروں؟ اگر ناگوار نہ گزرے؟''

'' کہو نا!''

'' اِتنے دِن ہو گئے۔ نائب السلطنت کے پاس چلیں گے نہیں تو انتظام کیسے ہو گا آگے چلنے کا۔''

غالب نے ایک لمبی سانس لی اور شعر فضا میں اُبھرا۔

رات دِن گردِش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کُچھ نہ کُچھ گھبرائیں کیا

7

پردے سے ڈھکے دو تین اِکّے شیر شاہ سوری کی جرنیلی سڑک پر بارش کے موسم میں بھیگتے ہوئے جا رہے تھے۔

'' پیڑوں کی شاخوں کے پتوں سے پانی گر رہا ہے۔''

غالب کا سفر جاری تھا۔ موسم بدل گیا تھا۔ غالب کا سفر نامہ سُنائی دیا۔

'' جُوں تُوں کر کے باندہ پہنچ گیا......''

باندہ یعنی بُندیل کھنڈ۔

''یہاں تقریباً چھ مہینے تک نواب صاحب کے مکان پر رہا۔ نواب ذوالفقار علی بہادُر اور میرے بزرگوں کے باہمی تعلقات تھے......''

نواب ذوالفقار علی بہادُر کی وسیلے سے غالب کو باندہ کے ایک شخص امین چند سے دو ہزار قرض مِلا جو زادِ سفر مُہیا کرنے کے کام آیا۔

'' خُدا کے کرم اور نواب صاحب کی تیمارداری اور توجہ سے مجھے بیماری سے نجات ملی۔ میں نے نواب سے اجازت چاہی......''

نواب صاحب کی حویلی کی ڈیوڑھی میں، مرزا نے ہاتھ کو پیشانی سے چھو کر نواب صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

'' اور الہ آباد پہنچو تو ایک خط بھجوا دینا۔ اچھا مرزا خُدا حافظ! تمھیں اللہ کی امان میں سونپا۔''

'' آپ غضب کرتے ہیں نواب صاحب!''

" کیوں میاں۔ کیا ہُوا؟"

" اُس نے آپ کی امان میں بھیجا تھا۔ آپ پھر اُسی کے حوالے کیے دے رہے ہیں۔"

ہنستے ہوئے غالب نے نواب صاحب سے وداع لی۔ نواب باہر تک چھوڑنے آئے۔

" اچھا مرزا۔ بڑے لمبے سفر پہ ہو۔ کلکتہ پہنچتے چار چھ مہینے تو لگ جائیں گے۔"

" جی ہاں دیکھیے نا۔ دلّی سے نکلے تو آج تک ایک زچگی پوری ہوئی۔ نو ماہ ہو گئے۔ بنارس پہنچتے کتنا وقت لگتا ہے؟"

" رات چلہ تارا پہ رُک جانا۔ کوئی خط وط بھجوانا ہو تو تھانیدار سے ہمارا نام کہہ دینا۔ وہ بھجوا دے گا۔"

8

سفر چلتا رہا۔ کبھی سواری پر کبھی ناؤ میں۔ غالب کا یہ سفر اُن کی زندگی کا سب سے بڑا سفر تھا۔

باندہ سے نکل کر دو روز موئدہ میں قیام کیا۔ ایک رات راستہ میں بسر کی۔ پھر چلہ تارا پہنچ گئے۔ (حالانکہ نواب صاحب نے کہا تھا کہ رات چلہ تارا پہ رُک جانا) اِس سفر میں تین دِن لگ گئے۔ اُن کے خطوں سے پتہ چلتا ہے کہ جو گاڑی باندہ سے کرائے پر لی تھی۔ اُس کی سُست رفتاری سے پریشان ہو گئے اور فیصلہ کر لیا کہ الہ آباد تک کا سفر کشتی سے طئے کریں گے۔

ناویں بنارس پہنچ گئیں اور بنارس کے گھاٹ نظر آئے۔ جب الہ آباد سے بنارس آئے۔ تو بہت دِنوں کے لیے یہیں رُک گئے۔ بنارس اُنہیں بھا گیا۔

9

بنارس کی ایک شام۔ گھاٹ کی سیڑھی پر غالب کھڑے تھے۔ کندھوں پر ایک خوشنما شال تھا۔ پانی پر تیرتے بجروں میں سے ٹھمری اور گھنگھروؤں کی آواز آ رہی تھی۔

بنارس اُس وقت ہندوستانی موسیقی کا اہم گھرانہ تھا۔ ایودھیا اور بنارس کا رقص کتھک، سارے ملک پر اپنی دھاک جمائے ہُوئے تھا۔

گھاٹ پر مُجرا تھا۔ اُس میں موسیقی اور رقص کی محفل تھی۔ غالب کے دِل و دماغ میں اِس رقص اور موسیقی کا اثر چھایا رہا۔ میاں داد خان کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"بھائی بنارس خوب شہر ہے۔ اور میری پسند کا ہے۔"

ایک مثنوی میں اُس کی تعریف لکھی۔ 'چراغ دیر' اُس کا نام رکھا۔ وہ مرزا کے فارسی دیوان میں موجود ہے۔

غالب کا حُلیہ بھی بہت بدل گیا تھا اُن دِنوں۔ سر کے بال لمبے تھے، گھنگھر الے۔ داڑھی لمبی ہو گئی تھی اور کاندھوں پر دوشالہ۔ وہ بالکل ایک جوگی لگ رہے تھے۔

10

بنارس کی تنگ گلیاں مشہور ہیں۔ ایسی ہی ایک گلی سے ہو کر مرزا اپنی کوٹھری کی طرف جا رہے تھے۔ سامنے سے ایک پردہ دار عورت آ رہی تھی۔ غالب ایک دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ عورت بچتے ہوئے گزرنے لگی۔ اچانک وہ کھڑی ہو گئی۔ اور غالب کی طرف پردہ اُٹھا کر دیکھتی رہی۔ وہ غالب کو دیکھتی رہی۔ اُنہیں پہچان بھی لیا لیکن غالب اُسے پہچان نہیں پائے۔

"مرزا! آپ مجھے نہیں پہچانتے لیکن میں آپ کو پہچانتی ہوں۔ میں..... میں نواب جان کی ماں ہوں۔"

مرزا کو حیرانی ہوئی۔ وہ اپنی خوشی چھپا نہیں پائے۔

"کہاں ہے نواب جان! میں اُس کے گھر گیا تھا دِلّی میں۔ اپنا ایک وعدہ پورا کرنے۔ لیکن مُلاقات نہ ہوئی۔"

"دِلّی چھوڑ کے ہم یہاں آ گئے تھے۔ کوتوال کی دھمکی کے ڈر سے۔"

"کہاں ہے نواب؟ اُس کی امانت ہے۔ ہم کندھوں پر اُٹھائے پھرتے ہیں جو اُس تک پہنچانی ہے۔"

غالب نے اپنے کندھوں پر اوڑھا ہوا دوشالہ چھوا۔

"آپ خاموش کیوں ہیں؟"

ملکہ کا گلا بھر آیا۔

"آخری وقت تک آپ کو یاد کرتی رہی۔ میری بیٹی کو گھُن لگ گیا تھا۔ اندر ہی اندر اُسے کوئی غم کھا رہا تھا۔ میں....."

اُس کی آواز رُندھ گئی۔ مرزا سکتے میں آ گئے۔ آنکھیں پونچھ کر ملکہ نے مرزا کی طرف دیکھا اور اِلتجا کی۔

"مرزا! ایک بار اُس کی قبر تک چلے چلو۔ شاید اُس کی رُوح کو تسکین ہو جائے۔"
غالب ملکہ کے ساتھ ہو لیے۔

11

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وِصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے ، یہی انتظار ہوتا

نواب جان کی آواز فضا میں تیرتی ہُوئی محسُوس ہو رہی تھی۔

ترے وعدے پہ جیے ہم ، تو یہ جان جُھوٹ جانا
کہ خُوشی سے مر نہ جاتے ، اگر اعتبار ہوتا

غالب نے اپنے کندھوں سے دوشالہ اُٹھایا اور نواب جان کی قبر پر پھیلا دیا۔ نواب جان نے اوڑھ لیا۔

کوئی میرے دِل سے پوچھے، ترے تیرِنیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہُوئے مرکے ہم جو رُسوا ، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا ، نہ کہیں مزار ہوتا

غالب قبر کے پاس بیٹھ گئے۔ فاتحہ پڑھا!

بَارَہ

1

ہمالیہ سے نکلی گنگا کلکتہ پہنچ کر ہگلی بن گئی۔ اس ہگلی میں ایک ملاح بھاٹیالی لوک گیت گا رہا تھا۔ اور مرزا کلکتہ پہنچ گئے۔

جہاں ٹھہرے وہاں گھر کے باہر رنگولی بنی ہوئی تھی۔ پاس میں دو ایک اور گھر تھے۔ ایک چھوٹی بچی 'دُرگا' رنگولی بنانے میں مست تھی۔

4 شعبان 1274 ہجری 21 فروری 1828 عیسوی مرزا غالب کلکتہ پہنچے تو، اُسی روز کسی غیر معمولی زحمت کے بغیر اُنہیں رہنے کو مکان مل گیا، شملہ بازار میں۔ مانک تلّہ سٹریٹ کے نکّڑ والے گرجے کے پیچھے ایک بازار ہوا کرتا تھا۔ شملہ بازار۔ اب وہاں بیتھون رو ہے۔ یہ مکان اُس جگہ تھا جہاں اب بیتھون رو کا مکان نمبر 133 ہے۔

مکان کی پہلی منزل کے برآمدے میں مرزا غالب کھڑے تھے۔ دائیں بائیں نظر پھیری اور آواز دی۔

"دُرگا!"

ایک چھوٹی سی لڑکی بنگالی ڈھنگ سے ساڑھی لپیٹے ایک دروازے سے باہر آئی۔ اُوپر دیکھا اور جواب دیا۔

"آشی بابا۔"

دُرگا نے کلسی پاس ہی رکھ دی اور سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر آ گئی۔ مرزا تب تک اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔ دُرگا نے کمرے میں آتے ہی پوچھا۔

"کی چائی بابا؟"

مرزا غالب نے مُسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بابا کسے کہتی ہو، بیٹی؟"

"پِتا جی کے بابا بولی۔"

'' اور بوڑھے کو کیا کہتے ہیں؟''

'' بڈھابابا۔ پتاجی بابا۔ تُمی بڈھابابا۔''

بوڑھے کو بڈھابابا کہہ کر دُرگا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اتنے دن کلکتہ میں رہتے رہتے، مرزا نے بنگالی کے کُچھ الفاظ جمع کر لیے تھے۔

'' چھ ماش (مہینے۔ماس) سے، آمی (میں) یہاں ہوں۔ آمی بیمار ہوں ناداوا (دوا) ......''

مرزا سمجھا نہیں پائے۔ اُن کی بنگالی کُچھ ایک لفظوں تک محدود تھی۔ دُرگا نے بڈھے بابا کی مُشکل جان کر پوچھا۔

'' تُمی دودھ کھابے؟''

'' ہاں ...... کھاؤں گا ! دودھ کھاؤں گا۔ دوا بھی کھاؤں گا۔ دُودھ گو...رم کور کے لاؤ۔''

مرزا نے دودھ کا برتن اُسے تھمادیا۔ برتن میں دودھ بھرا ہوا تھا۔ دُرگا جانے لگی۔

'' نوازش ہوگی۔''

دُرگا رُکی۔ پوچھا۔

'' کی بولے؟ (کیا کہا)۔''

مرزا نے سر ہلایا۔ لڑکی شاید سمجھ گئی۔ ہنستے ہنستے چلی گئی۔ اُسے جاتے دیکھ مرزا نے ہونٹوں کو گول بیضوی شکل دی اور 'او' آواز نکالی۔

'' او ۔ گرم .... گورم کر..... کور''

شاید مرزا اپنی بنگالی کا اور ریاض کرتے کہ دروازہ پر آہٹ سُنائی دی۔ کوئی ملنے آیا تھا۔ آواز آئی۔

'' ..... حاضر ہوسکتا ہوں؟''

یہ سراج الدین تھے۔ دروازے پر اُس نے دُرگا کو جاتے دیکھا تھا۔ مرزا اُس کی طرف مڑے۔ پہچانا تپاک سے بولے۔

'' آیئے آیئے میاں سراج الدین صاحب تشریف لائیے۔ بس آپ کا ہی انتظار رہتا ہے ہر صُبح۔''

مرزا نے اُسے بیٹھنے کی جگہ دی اور پوچھا۔

'' کہیے! کوئی سبیل نکلی، گورنر جنرل سے ملنے کی؟''

سراج الدین کے چہرے پر نااُمیدی چھائی رہی اور کُچھ دیر بعد جواب دیا۔

'' کوئی نہیں ..... دراصل اِن انگریز کارکنوں کی تبدیلیاں بھی اِتنی تیزی سے ہورہی ہیں کہ اُن کا تعاقب کرنا

بھی مُشکل ہوتا جارہا ہے۔ دفترِ فارسی کے سکتر (سیکریڑی) اینڈریو اسڑلنگ سے تو مل چکے۔ اُن کا کہنا ہے کہ.....''

مرزا کچھ جھنجھلا گئے۔ بار بار وہی بات.....

'' میں بار باراُن سے مِل کر کیا کروں، سراج الدین؟..... یہ معاملہ اُن کے ہاتھ میں نہیں ہے۔''

وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ دُور نظر اُٹھا کر کہا۔

'' چھ ماہ گزر گئے میاں..... دِلّی چھوڑے ڈیڑھ سال ہُوا۔ پتہ نہیں گھر پہ، سب کیسے ہوں گے..... ہرگوپال تفتہ کا خط آتا ہے..... تفصیل وہ بھی نہیں دیتے... لگتا ہے کُچھ چھپائے رکھتے ہیں مُجھ سے۔''

مرزا نے سراج الدین کی طرف دیکھا۔

'' .... میں کیا سمجھتا نہیں....؟ گھر پہ کُچھ نہیں ہوگا .... بچے کا دُودھ کہاں سے آتا ہوگا؟.....کون جانے؟''

مرزا سراج الدین کے پاس آ کر اُس کی بغل میں بیٹھ گئے۔ اُن کی آواز میں اُن کی مجبوری تھی۔ لاچاری تھی۔ اُنہوں نے اپنے گھاؤ سراج الدین کو دِکھا دیے۔

'' سراج الدین! ڈگریاں ہو رہی ہُوں گی میرے خِلاف ...... اِس بار۔ یہاں فیصلہ نہ ہوا تو دِلّی میں داخل ہونا مُشکل ہوگا میرے لیے ....میں قرض خواہوں کو مُنہ نہ دِکھا سکوں گا.....''

سراج الدین نے حوصلہ بندھانے کی بھرپور کوشش کی۔

'' ایسے مایوس نہ ہوں مرزا ! چارلس مٹکاف کے واپس آتے ہی سارا معاملہ طے ہو جائے گا۔ وہ مرہٹوں سے کوئی سمجھوتہ کرنے مالدہ گئے ہوئے ہیں۔ وہ آ جائیں تو مُجھے یقین ہے اِس بار آپ کا کام ہو جائے گا۔''

اِس بیچ ساڑھی کے پلّو سے گرم دودھ کا برتن لے کر دُرگا کمرے میں آ گئی۔

''ایئ تو بابا! تومار دودھ گرم کورے اینے چھی۔ (یہ لو بابا تُمہارا دُودھ گرم کر کے لائی ہُوں)''

مرزا نے اُٹھ کر گرم دودھ لے لیا۔

'' شاباش بٹی ۔ شاباش اور شُکریہ۔''

اجنبی کے سامنے دُرگا نے کُچھ نہیں کہا۔ اور موقعہ ہوتا تو دُرگا سوال کرتی۔ مرزا جواب دیتے پھر اُس جواب پر پھر سوال ہوتے.....دُرگا کو جاتے دیکھ کر سراج الدین نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

'' آپ اِمام باڑہ کے اُس طرف چل کر کیوں نہیں رہتے؟ مسلمانوں کا مُحلّہ ہے..... آسانی ہوگی۔ اِس ماحول میں خُود کو اجنبی پاتے ہوں گے۔''

'' بالکل اپنے ماحول میں ہوُں۔ یہاں کوئی اجنبیت نہیں ہے مُجھے۔ ہندوستان صرف آپ مسلمانوں کا مُحلّہ نہیں۔ ہمارے آنے سے پہلے بھی کُچھ لوگ یہاں رہتے تھے۔ یہاں کا تہذیب و تمدن ہماری پیدائش سے بھی پُرانا ہے

.... بنارس گئے ہیں کبھی؟ سومناتھ دیکھا ہے؟ حیرت ہے کہ ہم عمارتوں میں تاج محل اور لال قلعہ کے علاوہ کسی عمارت کا ذکر نہیں کرتے۔ عمارتوں کے بھی مذہب ہوتے ہیں کیا؟ تاج محل مسلمان ہے؟''

سراج الدین سُنتا رہا۔ مرزا کو ایک لطیفہ یاد آیا۔ اور ایک تجربہ کار گھوڑے کا واقعہ سُنایا۔

'' مُسلمانوں کی بھینس بھی مُسلمان اور ہندو کا گھوڑا ہندو۔

پچھلے دِنوں ایک بہت تجربے کار گھوڑا مِلا۔ کئی مذہب بدل چُکا تھا۔ پہلے کریم کے پاس تھا۔ پھر چیلا رام لے گئے۔ پھر کوئی رابرٹ لے گیا۔ اُس کے بعد ایک دُھومر سنگھ کے ہاتھ چڑھ گیا...... بڑی شِکایت کر رہا تھا۔ کسی مذہب میں دوسرے سے برتری نہیں دیکھی..... کسی نے ہاتھی نہ بنایا۔ گھوڑے کا گھوڑا ہی رہا۔''

برآمدے سے سیڑھیاں اُتر کر دونوں آنگن میں آ گئے۔ آنگن پار کر کے باہری دروازے تک پہنچے۔

مرزا اپنی بات کیے جا رہے تھے۔ پھر جیسے کُچھ یاد آیا اور کہہ بیٹھے۔

'' اور یہ بنگال تو کمال کی جگہ ہے صاحب۔''

سراج الدین نے مرزا کی طرف دیکھا۔

'' یہ بنگالی سو سال پیچھے بھی جیتے ہیں اور سو سال آگے بھی۔''

بات شاید سراج الدین کی سمجھ میں نہیں آئی۔

'' کلکتہ جیسا شہر تختۂ زمیں پر نہیں۔ یہاں کی خاک نشینی اِس جگہ کی حُکمرانی سے بہتر ہے۔ خُدا کی قسم اگر میں مجرد ہوتا اور خانہ داری کی زنجیریں میری راہ میں حائل نہ ہوتیں تو سب کُچھ چھوڑ چھاڑ کر عمر بھر یہیں کا ہو رہتا۔''

سراج الدین نے یاد دلایا۔

'' کل آپ کا خیال تھا کہ آپ ہندوستان میں نہ رہیں گے بلکہ ایران چلے جائیں گے اور وہیں آتشکدوں اور میخانوں میں زندگی کے باقی دِن گزار دیں گے۔''

مرزا غالب مُسکرا دیے۔

'' خیال ہی تو ہے۔ بدل بھی سکتا ہے۔ ایران کا اِرادہ اُس صورت میں تھا اگر پنشن نہ ملی۔

'' مِل جائے گی۔ انشاءاللہ۔ آداب۔''

غالب نے آداب کا جواب بھی دیا اور مہمان کو دروازے سے رُخصت بھی کیا۔ واپس مڑے تو آنگن کے ایک حصہ میں بھگوتی دُرگا کی ماٹی کی مُورت بنائی جا رہی تھی۔ کس پھُرتی سے کُمہار ٹولہ کے کاریگر یہ کام سرانجام دے رہے تھے وہ دیکھتے رہے۔

2

مرزا غالب اپنے شملہ بازار والے گھر کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ ڈھول اور تاشے کی آواز پر دُرگا پوجا کے منتر سُنائی دے رہے تھے۔ پجاری لوگ ہاتھ میں لوبان دان اٹھائے دُرگا کی پُوجا کر رہے تھے۔ مرزا کے مُنہ سے ایک لمبی آہ نکلی۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو اے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے معطّر کہ ہے غضب
وہ نازنیں بُتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ اُن کا اشارہ کہ ہائے ہائے

اِس بیچ دو لڑکے مرزا کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے آ گئے۔ آنگن کے پھاٹک کے سامنے سے دُرگا گزر رہی تھی۔ اُنہوں نے دُرگا سے پوچھا۔

''ایکھانے کونو میرجا اشد آلا کھان گالیب تھاکین نا کی؟'' (یہاں کوئی مرزا اسداللہ خاں غالب رہتے ہیں؟)

'' نہ نہ شے نام رکیو تھاکے نہ ایکھانے۔'' (اِس نام کا کوئی یہاں نہیں رہتا۔)

'' کی بولچھو؟ میرجا آلی شوداگر ریر باڑی ایٹائی تو۔'' (کیا کہتی ہو؟ مرزا علی سوداگر کا مکان یہی ہے نا؟)

دوسرے لڑکے نے پوچھا۔

''ہیں.....کِنتو ایتو مُشکیل نام رکونولوک نہیں ایکھانے.....کی نام بولے چھوٹمی۔'' (ہاں...لیکن اِتنا مُشکل نام والا کوئی یہاں نہیں رہتا ۔...کیا نام بتایا تم نے؟)

''میرجا اشعد آلہ کھاں گالیب۔دِلی تھیکے ایشے چھین۔'' (مرزا اسداللہ خاں غالب، دِلّی سے آئے ہیں)۔

مرزا اُوپر سے ساری بات سُن رہے تھے۔اُنہیں لگ رہا تھا کہ کوئی بنگالی لہجہ میں اُن کے نام کا ذِکر کر رہا تھا۔اچانک دُرگا کو کچھ یاد آیا۔

''ہیں ہیں .....دِلّی تھیکے ایک بھدرلوک۔'' (ہاں ہاں... دِلّی سے ایک بھلا مانس آیا ہے۔)

اور دُرگا نے بالکنی میں کھڑے مرزا کی طرف اِشارہ کیا۔

'' اوئی، بڑا بابا ایشے چھین۔'' (ہاں وہ بوڑھے بابا آئے ہیں)

غالب ہنس پڑے۔اچھا مذاق بن گیا اُن کے نام کا۔یہ لڑکے اپنی زبان کی گول گول گھُلی مٹھاس سے مجبور تھے۔اُنہوں نے اوپر سے ہی آواز دی۔

'' آجاؤ بھئی ... اوپر آجاؤ۔ مُجھ ہی کو تلاش کر رہے ہو تم لوگ۔ بنگالی میں تو میرے نام کا بھی اچھا خاصا رس گُلّہ بنا دیا آپ لوگوں نے۔''

دونوں لڑکے اوپر آگئے۔مرزا نے اُن کی آؤ بھگت کی۔دُعا سلام کے بعد مرزا نے دریافت کیا۔

'' کہاں سے تشریف لائے ہیں آپ صاحبان؟''

'' حُضور! مدرسہ عالیہ میں مُشاعرہ ہے کل رات۔ فارسی کے نامی شعراء تشریف لا رہے ہیں۔''

'' کون کون ہیں؟''

'' حضرت قتیل صاحب، جناب واقف صاحب، ہرات کے رئیس کِفایت خاں صاحب۔ ...... آپ ضرور تشریف لائیے۔ اِس اِتوار کا مشاعرہ آپ کے اعزاز میں منعقد کیا جارہا ہے۔''

مرزا غالب مان گئے۔ دلّی والوں نے اُنہیں فارسی کا شاعر نہیں مانا کبھی، شاید یہاں والے مان لیں۔

'' ضرور آؤں گا۔ لیکن کوئی صاحب آ کر لے جائیں۔ مُجھے گیارہ مہینے ہوگئے کلکتہ میں۔ ابھی پوری طرح یہاں کے راستوں سے واقف نہیں ہُوں۔''

پہلے لڑکے نے جلدی سے کہا۔

'' میں حاضر ہو جاؤں گا۔میرا نام رشید مصطفےٰ ہے۔بہت بہت عنایت آپ نے ہماری دعوت قُبول فرمائی۔''

'' بھئی بنگالی بہت اچھی بول لیتے ہو تم؟''

'' میری مادری زبان ہے حُضور!''

'' اچھا یہیں کے رہنے والے ہو۔''

'' جی۔ اِجازت دیجیے۔ خُدا حافظ۔''

دونوں لڑکے باہر آئے کمرے سے۔ مرزا عادت کے مطابق اِن دونوں کے ساتھ سیڑھیوں تک آئے۔

3

بنگال میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم میں اردو فارسی کی تربیت کے لیے مدرسہ عالیہ کھول دیا تھا۔ مُشاعرے کی رات مرزا مدرسہ عالیہ پہنچ گئے تا کہ وہ کلکتہ کے ادیبوں، دانشوروں اور اُستادوں سے رابطہ بڑھا سکیں۔ ایک مولوی صاحب بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔

'' بڑی فراخ دِلی ہے انگریزوں کی کہ فورٹ ولیم کے اورینٹل کالج میں ایک نیا محکمہ۔ ہندی اور سنسکرت کے لیے کھولا جا رہا ہے...... یہاں کے مسلمانوں کو اُردو، فارسی اور عربی کی تعلیم دی جا رہی ہے، وہیں ہندوؤں کو ہندی اور سنسکرت کی تعلیم دی جائے گی۔''

غالب کا نظریہ اِس کے بارے میں کچھ اور ہی تھا۔ اُنھوں نے اختلاف کیا۔

'' ہندی ہندوؤں کی ہے اور اُردو مسلمانوں کی۔ یہ کس نے کہہ دیا آپ سے؟ اردو پر ہر گوپال تفتہ کو اُتنا ہی حق ہے جتنا رسخان کو ہندی پر ہے۔ وارث اور فرید نے اگر پنجابی کو جلا بخشی تو امیر خُسرو نے فارسی کے ساتھ ساتھ اودھی میں بھی رس گھولا ہے۔''

آس پاس کھڑے حضرات کے کان کھڑے ہو گئے۔ غالب نے پھر کہا۔

'' یہ بٹوارہ ہے۔ زبان اور مذہب کے نام پر لوگوں کو بانٹ کر......''

سراج الدین نے دبی آواز میں کہا۔

'' اِس وقت خاموش رہیئے مرزا۔ اِس مُشاعرے میں کُچھ انگریز بھی شامل ہیں، وہ سُنیں گے تو..........''

مرزا نے اُن کی بات کاٹ دی۔

'' یہ انگریزوں کی چال ہے صاحبان۔ یہ بٹوارہ زبان کا نہیں ہے۔ .....لوگوں کو بانٹا جا رہا ہے۔ ورنہ کوئی

زبان کسی مذہب کی جاگیر نہیں ہے۔

ایک آدمی بحث کے لیے بیچ میں کود پڑا۔

'' لیکن قتیل صاحب فرماتے ہیں کہ.......... ''

'' میں اُس کھتری بچہ کی بات کیوں ماننے لگا جسے اپنی فارسی منوانے کے لیے مُسلمان ہونا پڑا۔''

سراج الدین کو سامنے آنا پڑا۔

'' مرزا۔ آپ اِدھر آئیے۔ آپ سمجھ نہیں رہے ہیں..... ''

'' میں سب سمجھ رہا ہوں سراج الدین۔ یہ انگریزوں کا سِکھایا ہوا......''

'' افوہ۔ آپ بات تو سُنیے۔''

مجبوراً سراج الدین نے مرزا کو کھینچ کر الگ کر دیا۔ باقی لوگ بہت چڑ گئے تھے۔ مولوی صاحب اُن کے سرغنہ تھے۔ ایک آدمی نے کہا۔

'' یہ تو سراسر بدتمیزی ہے صاحبان، بڑی ناشائستہ حرکت ہے مرزا کی۔''

'' چلیے چلیے مُشاعرے کا وقت ہو رہا ہے۔'' دوسرے نے یاد دلایا۔

سبھی مشاعرے میں شامل ہونے کے لیے چل دیے مرزا اور سراج الدین بھی....

4

مُشاعرے میں اوروں کے ساتھ ساتھ مرزا نے بھی اپنے شعر کہے۔ لیکن قتیل اور مولوی صاحب کے گڑھ میں مرزا کے ہر شعر کا اِستقبال ایک خاموشی نے کیا۔ جن کے اعزاز میں یہ مشاعرہ مُنعقد ہوا تھا اُن کے ساتھ ہوئی بے رُخی سراج الدین نے بھی محسوس کی۔ اور اگلے دِن جب سراج الدین مرزا سے شملہ بازار کے اُس مکان پر ملے تو اُس نے مرزا کو اُس سازش کی تفصیل دے دی۔

'' سارے علامہ ناراض ہو گئے ہیں آپ سے۔ کُچھ نوجوانوں نے تو آپ کے خلاف اشتہار لگا دیے ہیں دیواروں پر۔''

مرزا کا ماتھا ٹھنکا۔ لیکن اُنہوں نے مذاق میں پوچھا۔

'' اچھا....؟ ..... میری دیوار پر تو ایک بھی نہیں۔''
سراج الدین معاملے کی سنجیدگی سمجھتا تھا۔ اُس نے مرزا کو آگاہ کیا۔
'' ذرا چل کر دیکھیے۔ جو شعر آپ نے مُشاعرے میں پڑھے تھے۔ اُن کی اصلاح.....''
'' تو کیا مجھے اپنے اشعار اُن سے صحیح کرانے ہوں گے۔''
'' وہ آپ کی فارسی کی اصطلاحوں سے مُتفق نہیں۔''
'' نہ ہُوں! وہ لکھیں ناں اپنی طرح...... یا اُس ..... قتیل کی نقل کریں۔ میری طرح لکھنے کے لیے.......''
لیکن سراج الدین کو ڈر کسی اور بات کا تھا۔ قتیل اور اُس کے ساتھی اِس معاملے کو دُوسرا ہی رنگ دے دیں گے۔ شعروں کی اصلاح ایک ابتداء تھی ایک بہانہ تھا۔ شاید اُن کا مقصد مرزا غالب کے خلاف ایک مورچہ کھولنے کا تھا۔ جس کے بعد وہ غالب کے وہ بیانات سامنے لائیں گے جہاں اُنہوں نے گوراشاہی کے خلاف وقت بوقت اپنی ناراضگی ظاہر کی تھی۔
'' مُجھے اُن کی فِکر نہیں ہے۔ مُجھے فِکر یہ ہے کہ کہیں بات زیادہ طول پکڑ گئی تو اِن انگریزوں تک نہ پہنچ جائے!.....آپ کی پنشن کا فیصلہ اُنہیں لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔''
'' دیکھو بھائی سراج الدین! خُدا گواہ ہے میں' آویزش بیانی' سے نہیں ڈرتا اور نہ مجھے اعتراضوں کا خوف ہے۔ صرف یہ خیال گزرتا ہے کہ اِتفاق سے چند روز کے لیے آیا ہوں۔ اگر آپ لوگوں کو ناراض کر لوں گا تو آپ ہی بعد میں کہیں گے کہ دِلّی سے ایک 'شوخ چشم' اور بے حیا شخص آیا تھا جس نے بزرگوں سے جھگڑا کیا........خُدا نہ کرے میں اپنے وطن کی بدنامی کا باعث بنوں.....بس معذرت خواہ ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ آپ یہ واقعہ بھول جائیں!''
سراج الدین بات سمجھ گیا۔ لیکن پھر بھی اُسے یہ ڈر تھا کہ بات طول پکڑ لے گی۔
'' سِراج بھائی آپ شاید بادِ مخالف کے عادی نہیں ہیں۔ اور مُجھے اِس کا بہُت ریاض ہے۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہُوں.......کِسی طرح، جلد سے جلد، میری ملاقات جناب چارلس مٹکاف صاحب سے کرا دیں تا کہ میں جلد سے جلد آپ کے خطّہ زمین سے نِکل جاؤں۔''
اِس کے بعد مرزا اندر چلے گئے اور سراج الدین اُنہیں جاتے دیکھتا رہا۔

مرزا غالب نے کلکتہ والوں کو بھلے ہی معاف کر دیا تھا لیکن کلکتہ کے عُلما نے اُنہیں نہیں بخشا۔ انگریزوں کے کان بھر دئے تھے۔ مٹکاف نہ صرف ناراض تھے بلکہ غصّے میں اُس نے مرزا کو بے عزت کر کے اپنے دفتر سے نِکال دیا۔ اُس نے سراج الدین کو بھی نہ بخشا۔

''چلا جاؤ۔ گیٹ آؤٹ۔ ڈلی (دِلّی) واپس جاؤ۔ تُم انڈین لوگ کمینہ لوگ ہے۔ چوٹا ڈِل چوٹا ڈِماگ (چھوٹا دِل چھوٹا دِماغ) ڈور کا بات نہیں سوچنے سکتا۔ (دور کی بات نہیں سوچ سکتے۔)''

مٹکاف کے دفتر کی دیواریں لال رنگ کے فلالن سے سجی ہوئی تھیں۔ دِیواروں پر ہندوستانی ریاستوں اور جاگیرداروں کی تلواریں، ڈھالیں، نیزے، خاص کر اُن ریاستوں کے الم اور نشان جواب کمپنی بہادر کے علاقوں میں شامل کر دی گئی تھی۔

مرزا غالب کھڑے کھڑے چُپ چاپ سُنتے رہے۔ سراج الدین کُچھ دور سہا ہوا کھڑا رہا۔

'' ..... ہندوٗ مُسلم بھائی بھائی بولٹا (بولتا) کیسا بھائی؟ مرڈرر (MURDERER)؟ بھائی؟ کِلر (killer) بھائی.......؟ دونوں ہر وقت لڑتا۔ خُون کرتا ....ہم الگ الگ کر کے رکھتا۔ لڑواتا نا ہیں۔ تم بولٹا (بولتا) تقسیم کرتا۔ Divide کرتا... Stupid....... آگے کا ناہیں سوچتا۔''

سراج الدین نے ڈرتے ڈرتے مُنہ کھولا۔

سر۔ مرزا غالب کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔ وہ کہنا چاہتے تھے کہ......''

مٹکاف نے اُسے ٹوک دیا۔

'' نہیں مانگٹا ...... کُچھ سُننے کو نہیں مانگٹا۔ تم اپنا کیس (Case) دِلّی میں ولیم فریزر کا پاس لے کر جاؤ ....جاؤ۔''

اور پھر بڑبڑانے لگا۔

'' اُدھر۔ تمہارا یوُزلیس (Useless) ظلِّ سبحانی بادشاہ کے پاس جاؤ۔''

غالب تیر کی طرح باہر آ گئے۔ مٹکاف اُنہیں دیکھتا رہ گیا۔ سراج الدین نے جلدی سے آداب کیا اور

مرزا کے ساتھ ہو لیے۔

6

مایوس ہو کر مرزا غالب واپس آئے۔ ناؤ سے روانہ ہُوئے۔ رُکنے کی اب کوئی وجہ نہیں تھی۔ اب کوئی اُمید نہیں تھی۔ بس یہ کہ گھر لوٹنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اب دو ڈھائی سال بعد قسمت اُن کے ساتھ کیا کھیل کھیلتی ہے۔ واپسی اِتنی طویل نہیں تھی جتنی تکلیف دہ تھی۔

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زُلف کے سر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بیتاب
دِل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافُل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تُم کو خبر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسد، کِس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ٹیرہ

1
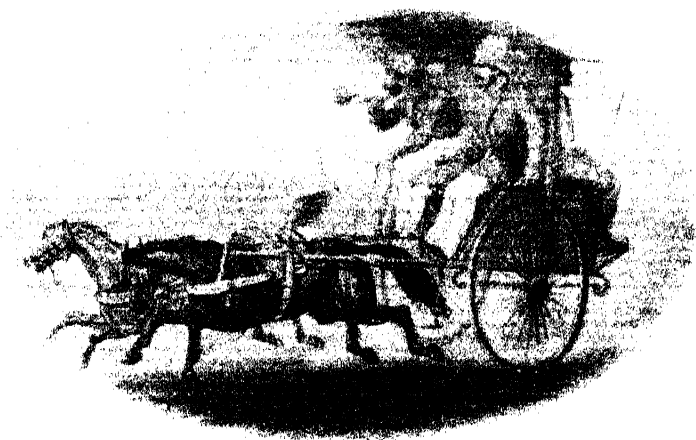
کسی صورت مرزا واپس دِلّی پہنچے۔ دِلّی کی جرنیلی سڑک سے ایکہ ایک ہریالے راستے سے ہوتا ہوا گلی قاسم جان میں داخل ہوا۔ دروازے پر ہی مُفتی صاحب موجود اور اُن کے پیچھے کلّو میاں اُن کے استقبال میں کھڑے تھے۔ مرزا ایکہ سے اُترے اور مُفتی صاحب کو سلام کیا۔

'' اسلام علیکم۔''

مُفتی صاحب نے سلام کا جواب گرم جوشی سے دِیا اور گلے لگے۔

'' وعلیکم اسلام۔''

مرزا نے مکان پر نظر ڈالی۔

'' خیر سے مکان تو ابھی وہیں قائم ہے۔ اِتنے برسوں میں کھِسکا نہیں اپنی جگہ سے۔''

کلّو میاں تب تک ایکہ سے سامان اُٹھا چکے تھے۔

'' کیسے ہو کلّو میاں۔ بیگم کیسی ہیں؟''

کلّو میاں نے سر کے اِشارے سے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے۔

'' وفادار، سُنا تھا! چلی گئیں۔''

'' پھر لوٹ آئیں حُضور! گاؤں میں جی نہیں لگا اُن کا۔''

'' اور چھوٹے میاں؟ چلنے پھرنے لگے ہوں گے اب تک تو۔ ٹہلنے جاتے ہوں گے باہر۔''

کلّو نے نظریں جھکا لیں۔ دُوسری طرف دیکھنے لگے۔ مرزا نے گھبرا کر پوچھا۔

'' کیا ہؤا؟ چھوٹے میاں کی طبیت تو ٹھیک ہے؟''

غالب چوغا اُٹھا کر گھر کے اندر داخل ہو گئے۔

گھر کے بھیتر آ کر اُنہوں نے دیکھا کہ بیگم خواب گاہ کی دہلیز پر کھڑی تھیں، اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

بات کُچھ کُچھ سمجھ میں آنے لگی۔ اچانک بیگم پھوٹ کے رو پڑیں۔ مرزا نے مُفتی صاحب کی طرف دیکھا وہ بھی کچھ غمزدہ کُچھ بُجھے ہوئے تھے۔ آہ بھر کر اُنہوں نے مرزا کو سمجھایا۔

''صبر کرو مرزا۔ اُس کی مرضی میں کیا پوشیدہ ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔''

پھر ایک لمبی آہ بھر کر کہا۔

''اُس کے راز نرالے ہیں۔''

بس اِسی بات پہ مرزا کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا۔

''راز کیا ہے مفتی صاحب؟ کیا پوشیدہ ہے؟ میرے ایک بیٹا ہوُا تھا..... وہ مر گیا۔ اور دفن ہے قبر میں.... اتنی سی چھٹنکی سی جان اور اُس پر مَنوں مٹی پڑی ہے کہ کم بخت کروٹ بھی نہ لے سکے...... اِس میں راز کی کون سی بات ہے؟ جنا تھا بیگم نے۔ اور مارا اُسے، اُس نے، جس کی مرضی بغیر کوئی مر بھی نہیں سکتا۔''

مرزا اِس کے آگے کچھ بول نہیں پائے۔ دُوسروں کے درد کو زبان دینے والا اِس وقت اپنے الفاظ کھو بیٹھا۔ مُفتی صاحب نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''تمہیں نے کہا تھا مرزا۔''

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غالب بس 'ہوں' کہہ کر رہ گئے۔ دونوں دوست چل کر اوپر کے کمرے میں آ بیٹھے۔ اِس بیچ کلّو شربت لے آیا۔ مفتی صاحب نے ایک گلاس مرزا کو دیا۔ مرزا نے اُسے میز پر رکھ دیا۔ اور آنکھیں موند کر پڑے رہے۔ مفتی صاحب نے آواز دی۔

''مرزا!''

مرزا نے آواز اَن سُنی کر دی اور تھوڑی دیر بعد چھت کی دیوار تک آ گئے۔ نیچے سُونا آنگن تھا۔ اِسی سُونے آنگن میں ماضی کا ایک اور ہی منظر آنکھوں سے گذر گیا۔

مرزا اُٹھے اور باہر چلے گئے۔ مفتی صاحب اُنہیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

2

چھوٹے میاں کو ڈھونڈتے ہوئے مرزا اپنے خاندانی قبرستان میں آ گئے۔ ایک ننھی سی قبر اور اُس میں مدفن امراؤ اور مرزا کے چھوٹے میاں! اِسی منظر پہ اُبھرے مرزا کے اشعار:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دِن اور
تنہا گئے کیوں ، اب رہو تنہا کوئی دِن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو 'قیامت کو ملیں گے'
کیا خُوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دِن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دِن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے!
کرتا ملک الموت تقاضہ کوئی دِن اور

کسی آواز نے مرزا کو چونکا دیا۔ تلاش رُک گئی۔

"اسد بھائی!"

غالب نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ بنسی دھر کھڑے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں، ذرا درگاہ تک ہو آؤں!"

بنسی دھر حیران ہوئے۔

''درگاہ تک؟''

''ہاں! ایک چادر چڑھانی باقی ہے۔ایک چادر چڑھائی تھی، جب منّت مانگی تھی بچّے کی۔ ایک اور چڑھانی تھی شکرانے کی۔''

غالب بنسی دھر کے قریب آ گئے۔

''اب ایک معذرت کی چادر اور چڑھا آؤں۔معافی مانگ آؤں خوامخواہ تکلیف دی آپ کو!''

بنسی دھر نے دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔وہ مرزا کی تلخی پہچانتے تھے۔

''من کڑوا مت کرو، اسد؟''

''میں نہیں کرتا، لالہ؟'' مرزا کی آنکھوں کے ڈورے لال ہو گئے۔

''اُس عورت کا کیا کروں جو بچّے جنتے جنتے مری جا رہی ہے گود بھرنے کے لیے......اُس کی گود لاشوں سے بھری جا رہی ہے لالہ! یہ پانچواں بچہ تھا.....''

آنسو پلکوں تک آ کر تھم گئے۔بہے نہیں۔وہیں منجمد ہو گئے۔لالہ بنسی دھر مرزا کو واپس لے جانے کے لیے آئے تھے۔

''چلو۔ چلو گھر چلو۔''

آسمان سانولا ہو رہا تھا۔دور دونوں دوست جاتے دِکھائی دیے۔ٹوٹے ہوئے سے بے جان سے۔

3

غالب اپنے کمرے میں اکیلے تھے۔ دِیوان کے پاس ایک شمع جل رہی تھی۔سامنے لکھنے کی چوکی کاغذ قلم دوات۔پاس میں ایک آدھی بوتل شراب کی سامنے ایک بھرا ہوا جام کونے میں کئی خالی بوتلیں۔ غالبؔ کے ذہن میں کئی اشعار گونج رہے تھے۔

بس کہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

روز و شب کچھ اِسی طرح کٹنے لگے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا

تجھ سے قسمت میں مِری صورتِ قفلِ اَبجد
تھا لِکھا بات کے بنتے ہی جُدا ہوجانا

غالب کبھی سوچ میں ڈوبے ہوتے، کبھی قلم لیے کاغذ پہ لکھتے نظر آتے۔

اِبن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کُچھ نہ سمجھے خُدا کرے کوئی

وہی گھر وہی چھت۔ وہی مرزا کے پڑھنے لکھنے کا کمرہ۔ اب کمرے کے کونے شراب کی خالی بوتلوں سے بھر گئے تھے۔ غالب نے سامنے پڑی بوتل اُٹھائی، خالی تھی۔ کلّو میاں پاس ہی تھے۔ بادام پستہ کی رکابی لیے۔

"کلّو میاں! یہ بوتل ہٹاؤ سامنے سے۔ اِس کا خالی چہرہ اچھا نہیں لگتا ہمیں۔"

کلّو میاں نے خالی بوتل اُٹھالی۔

"شراب تو اور نہیں ہے حُضور!"

مرزا نے خالی بوتلوں کی طرف اِشارہ کیا۔

"اِن بوتلوں میں دیکھو اگر کُچھ قطرے بچے ہوں؟"

کلّو مُنہ لگا نوکر تو تھا ہی۔

'' آپ جس بوتل سے پئیں حضور! اُس میں قطرہ بچتا ہے کبھی؟''
مرزا غالب نے ایک شعر کہا۔

مئے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

4

وہی برساتی، کئی دِنوں بعد شام کے وقت ہرگوپال تفتہ تشریف لائے تھے۔ مرزا نے دِل جوئی کے لیے پوچھا۔
'' شراب پیوگے؟''
'' میں نہیں پیتا اُستاد!''
''جاڑوں میں بھی نہیں پیتے؟ .... جاڑوں میں ضروری ہو جاتا ہے بھائی۔ ورنہ اندر اُوڑھنے کو کچھ نہیں رہتا۔''
تفتہ شرما گئے۔ پہلے اِس طرح کبھی گفتگو نہیں کرتے تھے اُستاد! مرزا نے بات بدلی۔
'' خیر تم کہو، کیسے آنا ہُوا؟''
'' اُستاد حضور یہ میک فرسن نامی شخص کون ہے؟''
'' ایک انگریز ہے۔ اور شراب کی دُکان کرتا ہے میرٹھ میں۔ کچھ عرصہ سے دِلّی میں بھی دُکان کر لی ہے۔ میری ضروریات کا سامان وہیں سے آتا ہے۔''
''کون سی ضروریات؟''
'' شراب کی دُکان سے اور کون سی ضروریات پوری ہوں گی ہرگوپال؟ انگیٹھی کے کوئلے تو منگوانے سے رہا۔''
'' اِس انگریز سے کیسے اُدھار لے لیا آپ نے؟''
''اِس لیے کہ انگریزوں پر میرا پنشن کا قرض بہُت ہے۔''
'' آپ کا قرض تو ہندوستان کے بادشاہ پر ہے۔''
'' لُو ظفر بادشاہ ہو گئے، پر ہندوستان کی بادشاہت اب کس کی ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا!........ حکومت بہادر شاہ ظفر کی ہے اور حکم چارلس مٹکاف کا چلتا ہے۔ ملکہ اِنگلستان میں ہے اور بادشاہت ہندوستان میں۔''

'' اِس میک فرسن نامی شخص نے بھی نالش کر دی ہے آپ پر۔''

'' اُس نے بھی کر دی، کیا مطلب ہُوا؟ اِس کے علاوہ بھی کوئی ہے؟''

'' کیا آپ نہیں جانتے اُستاد؟ متھر داس اور سُکھ چین۔ دونوں نے کچہری میں کاغذات داخل کر دیے ہیں .... اُنہیں خبر مل گئی ہے کہ کلکتہ سے آپ ناکام لوٹے ہیں۔''

مِرزا نے ایک سانس لی۔ اور کہا۔

'' ایک درباری مل بچا ہے۔ اُسے بھی خبر کر دیں۔''

تفتہ نے جھنجھلا کر کہا۔

'' آپ کو مذاق سُوجھتے ہیں۔ وہاں ایک پہ ایک مقدمہ دائر ہوتا جا رہا ہے آپ پر۔''

مِرزا نے ایک لمبی سانس لی۔

'' دیکھو بھائی! یہ مقدمے مُجھ پر نہیں۔ سب میری پنشن پر دائر ہو رہے ہیں۔ سب اُسی کی اُمید میں مُجھ پر ایمان لائے تھے۔ میری حیثیت تو پیغمبر کی ہے۔ اللہ کی حیثیت پنشن کی تھی۔''

ہرگوپال خاموش ہو گئے۔ تبھی کلّو میاں داخل ہوئے۔ غالب نے دیکھا کلّو بھی کُچھ پریشان حال تھا، پوچھا:

'' کہو بھائی! تمہارے چہرے پر بھی کوئی نالش نظر آتی ہے۔ اب کس کا مقدمہ ہے؟''

کلّو ہچکچایا۔

'' میں۔ میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔ معافی چاہتا ہوں مُخل ہُوا۔''

'' کہہ دو، کلّو میاں! تفتہ بھائی سے کوئی پردہ نہیں ہے ہمیں۔''

کلّو پس و پیش میں تھا۔ آخر بولنا ہی پڑا۔

'' یوسف بھائی کی بیگم اور بچّے جے پور جانا چاہتے ہیں۔''

'' کیوں؟''

'' بیگم شاید خفا ہیں۔ اپنے مائکے جانا چاہتی ہیں۔''

غالب تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئے۔

'' جاؤ کہہ دو۔ کل تک انتظام ہو جائے گا۔''

کلّو چلا گیا۔ تفتہ کو یہ فیصلہ کچھ جلد بازی کا لگا۔

'' یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ بھاوج کو سمجھائیے ذرا!''

مِرزا نے گہری سانس لی۔ اب تفتہ کو سمجھائیں تو کیا سمجھائیں۔

'' تفتہ بھائی! میں خود تھک جاتا ہوں یوسف میاں کو سنبھالتے سنبھالتے۔ سوچو اُس عورت کی کیا حالت ہوتی ہوگی...... مائیکے جائے گی تو کچھ روز سانس تو لے سکے گی۔ .... مُشکل صرف ایک ہے۔''

کہتے کہتے غالب خاموش ہو گئے۔

'' کیا ؟''

'' اُدھار اب کس سے لوں؟ درباری مل دے گا؟''

تفتہ اُن کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

5

ضرورت اور حاجت آدمی سے کیا کچھ نہیں کراتی مرزا غالب وہیں پہنچ گئے سیٹھ درباری مل کے پاس۔

'' کلکتہ سے میری پنشن کا حق تو نامنظور ہوا درباری مل۔ متھرا داس اور سُکھ چین سیٹھ ڈگری لا رہے ہیں مجھ پر۔ لیکن ضروریات کا کیا کروں؟ بلا ناغہ پہنچ جاتی ہیں۔ بھاوج اور بچّوں کو جے پور بھیجنا ہے۔ اور پھر میری اپنی ضروریات تُم جانتے ہو......... آج رات کی شراب بچی ہے۔ کلّو کے پاس ایک روپیہ سات آنے بچے ہیں۔ بیچنے اور رہن رکھنے کے لیے، کچھ نہیں ہے میرے پاس........ ایک سو باسٹھ روپے کی آمد اور تین سو کا خرچہ۔ یعنی ایک سو چالیس کا گھاٹا ہر ماہ سہتا ہوں بتاؤ۔ تم گزر کر سکتے ہو اِس پر؟

درباری مل نے پاندان سے پان نِکالا۔

'' پان تو آپ کھاتے نہیں۔ سُنا ہے آپ کو زہر لگتا ہے۔''

'' زہر ہوتا تو کھا لیتا...... پان ہے اِسی لیے نہیں کھاتا۔''

درباری مل نے بہی کھاتہ نِکالا اور کہا۔

'' پتہ نہیں مرزا ۔ میں یہ کیوں دے رہا ہوں آپ کو ؟ ....لیکن دے رہا ہوں۔''

6

مفتی صاحب مرزا غالب کو ڈھونڈتے ہوئے حاجی میر کی دُکان پر آ گئے۔

" آداب میر صاحب۔"

" آداب آداب۔ زہے نصیب آپ ہمارے ہاں تشریف لائے۔"

" میر صاحب! مرزا نوشہ سے ملنا تھا۔ ایک ذرا زحمت تو ہوگی....."

" تشریف لے آیئے جناب! وہ سامنے تشریف فرما ہیں۔"

دُکان کے بھیتر کے حصہ میں مرزا ورق گردانی کر رہے تھے۔ اُنہوں نے میر صاحب کی طرف دیکھا۔

" کون ہیں میر صاحب! ہم سے....."

اور پھر مفتی صاحب پر نظر پڑ گئی۔

" آہا ہا۔ مفتی صاحب آیئے آیئے۔"

" میاں نوشہ۔ اب تُم بوڑھے لگنے لگے ہو۔ سفیدی چھلکنے لگی ہے داڑھی میں۔"

مرزا نے ایک شعر سُنایا۔

رَو میں ہے رَخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے۔ نہ پا ہے رکاب میں

مرزا نے مفتی صاحب کو آرام سے بٹھایا۔

" کہیے اب کس جُرم کے لیے میری تلاش تھی؟"

" ایک روز شام کو حاضر ہوا تھا آپ کے دولت کدے پر۔ معلوم ہؤا آپ شراب نوشی میں مُبتلا ہیں۔ اِس لیے اوپر نہ آیا۔"

" آ جاتے مفتی صاحب۔ آپ بھی ذرا چکھ لیتے۔"

''اِس معاملے میں ہم ذوق کے قول پر یقین رکھتے ہیں۔''

اے ذوق ! دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر ، لگی ہوئی

''اچھا آپ صاحبانِ شراب کے اِتنے خِلاف کیوں ہیں؟ آخر کون سی بُرائی ہے اِس میں؟''

مفتی صاحب شراب کی خرابی اُنگلیوں پر گِن کر بتانے لگے۔

'' سب سے پہلے، کہ شرابی کی دُعا قُبول نہیں ہوتی۔''

مِرزا نے بیچ میں ہی کاٹ دیا۔

'' لیجیے! جس کے پاس شراب موجُود ہو اُس کم بخت کو اور کون سی دُعا کی ضرورت ہے؟''

دونوں کِھلکِھلا کر ہنس پڑے۔ اِتنے میں ایک لڑکا دو پیالے قہوہ لے کر حاضر ہوا۔ حاجی میر نے کہا۔

'' قہوہ نوش فرمایئے حضرات۔''

'' آپ نے کیوں تکلیف کی میر صاحب۔''

''ارے صاحب یہ آفتاب اور ماہتاب ایک ہی دِن اِکٹھے کہاں نظر آتے ہیں۔ یہ پلٹی دروازے کا قہوہ بہت مشہور ہے نوش فرمایئے۔''

دونوں حضرات نے قہوے کی پیالیاں تھام لیں۔

'' فرمایئے کیسے تشریف آوری ہوئی؟''

مفتی صاحب نے جیب سے ایک خط نکال لیا۔

'' حضرت ناسخ میاں کا خط آیا ہے۔ لکھا ہے آج کل دکّن میں ہُن برس رہا ہے۔ حیدرآباد کے مہاراج چندو لال ایک کمال کے قدرداں ہیں۔ اگر وہاں چلے جائیں تو سب دِلدّر دُور ہو جائیں گے۔''

مِرزا کُچھ سوچ میں پڑ گئے۔

'' مفتی صاحب! پہلے تو قرض ادا کیے بغیر یہاں سے ہلنا محال ہے۔ پھر اگر جاؤں بھی تو چندو لال غریب میری کیا قدر کرے گا۔ جہاں فارسی کے قتیل اور اُردو میں شاہ نصیر اُستاد مانے جاتے ہیں۔ وہاں غالب اور ناسخ کو کون پوچھتا ہے۔''

مفتی صاحب خاموشی سے قہوہ پیتے رہے۔

''علاوہ اِس کے مفتی صاحب! وہ اسّی برس کا بوڑھا خود قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے..... جب تک میں

حیدرآباد پہنچوں......وہ عدم آباد پہنچ چکا ہوگا۔''

'عدم آباد' بولتے وقت مرزا نے آسمان کی طرف اِشارہ کیا۔ مرزا اور مفتی نے جُوتیاں پہن لیں اور دونوں دوست خاموشی سے دُکان کے باہر آگئے۔

دُکان سے باہر آکر دونوں نے سڑک پکڑی اور مفتی صاحب نے اپنی چپّی توڑی۔

'' دِلّی کالج میں فارسی پڑھانے پر بھی آپ رضامند نہ ہوئے۔''

مرزا نے اُن کی طرف دیکھا۔

'' آپ کو کس نے بتایا ؟''

'' خود جیمس ٹامسن نے۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُن کے پاس تین نام آئے تھے، جنہیں دِلّی میں فارسی کا اُستاد مانا جاتا ہے۔''

مرزا نے اپنے شوخ انداز میں پوچھا۔

''دوسرے اور تیسرے درجے پر کون تھے؟''

'' حکیم مومن خان مومن اور شیخ اِمام بخش صہبائی کے نام دیے گئے تھے اُنہیں۔''

'' تو ٹامسن صاحب نے یہ بھی بتایا ہوگا کہ نوکری میں نے کیوں چھوڑی۔''

اِس بیچ کُچھ خالی پالکیاں سڑک سے گزر گئیں۔ اب مرزا نے اپنی وجہ بیان کی۔

'' مُلازمت اِس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ اُس سے میرے عزّ و ناز میں اِضافہ ہو۔ نہ کہ جو پہلے سے ہے اُس میں بھی کمی آجائے۔''

'' لیکن آپ ملازمت کرنے کے لیے گئے تھے......''

مرزا کے برتاؤ میں کچھ تلخی آگئی۔ اُنہوں نے مفتی جی کی بات کاٹ لی۔

'' .... ملازم کی حیثیت لے کر نہیں، زبانِ فارسی کے اُستاد کی حیثیت سے گیا تھا......اُن کے گھر پر۔ کالج یا مدرسے میں نہیں۔...اور وہ اُٹھ کر استقبال نہ کر سکے؟''

مرزا بولتے بُولتے کُچھ طیش میں آگئے۔ اُنہوں نے ایک خالی پالکی روک لی اور اُس میں جا بیٹھے۔ پالکی اُنہیں لے کر چل دی۔ مفتی صاحب دیکھتے رہ گئے اور جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہُوئے۔

'' مرزا تم جان گئے تھے یہ تجویز میری تھی۔ اِس لیے یہ احسان نہ لیا تم نے۔''

7

مفتی صاحب سے پنڈ چھڑا لینا ایک بات تھی لیکن وکیل ہیرالال ماننے والوں میں نہ تھے۔ اُنہوں نے مرزا کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وکیل صاحب اپنے دفتر میں قانونی کتابوں سے گھرے بیٹھے تھے۔

'' ملازمت تم سے ہوگی نہیں۔ پینشن تمہاری ملے گی نہیں۔ اخراجات کم نہیں ہوتے۔ تو پھر کیا کرو گے؟ جُوا کھیل کر گذارہ کرو گے زندگی بھر؟...... بھول جاؤ کہ بادشاہ تمہیں کسی دِن دربار میں بُلائیں گے؟ ابراہیم ذوق کے ہوتے ہوئے تم کہیں پاس بھی نہیں پھٹک سکتے........''

وکیل کو کیسے چُپ کراتے اور اُس وکیل دوست کو جو غُصے میں بھرا ہُوا ہو۔

'' جتنا قرض لے سکتے تھے، لے چکے۔ بلکہ اِتنا لے چکے ہو جتنا نہیں لینا چاہیئے تھا۔ ......کہاں سے ادا کرو گے وہ سب؟ تُمہارے پاس کُچھ بیچنے اور گروی رکھنے کو بھی نہیں ہے۔ کرایہ کے مکان میں رہتے ہو اور......''

غالب سر جھکائے سُن رہے تھے۔

'' کُچھ سمجھ میں آتا ہے جو میں کہہ رہا ہوُں؟''

مرزا نے تُلے لفظوں میں جواب دیا۔

'' ہیرالال! تُم وہ سب بتا رہے ہو، جو میں جانتا ہوُں .... جو میں نہیں جانتا وہ یہ ہے کہ کل جب متھرداس ڈگری لے کر میرے مکان پر آئے گا تب کیا ہوگا؟''

ہیرالال نے سنجیدگی سے حقیقت بیان کی وہ اب چڑ بھی گئے تھے۔

'' ہوگا یہ کہ کچہری کے چار کارندے آپ کو گھر سے لے کر کچہری تک جائیں گے۔''

مرزا نے پوچھا۔

'' ہتھکڑی بھی لگائیں گے؟''

مُستقبل کا منظر مرزا کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ لال وردی پہنے دو کارندے آگے اور دو کارندے پیچھے اور مرزا سر جھکائے اُن کے درمیان چل رہے تھے۔ آس پاس، گلی کے راہ گیر اُن کو دیکھ رہے تھے۔ اور ہیرالال

بیاں کیے جا رہے تھے۔

''نہیں یہ حق اُنہیں نہیں ہے۔لیکن دو کارندے آپ کے آگے ہوں گے، دو پیچھے اور آپ سر جھکائے اپنی گلی سے گزریں گے۔شرم و حیا سے زمین میں گڑے ہوئے .... اور اِس طرح آپ کو کچہری تک لایا جائے گا کٹہرے میں کھڑا کر دیا جائے گا۔''

اور حقیقتاً جب مرزا کو کارندے لے کر جا رہے تھے، اُس وقت تفتہ وہاں گلی میں موجود تھے۔

8

غالب عدالت کے کٹہرے میں کھڑے تھے۔سامنے مجسٹریٹ اور عدالت کے باقی ملازم۔ہیرا لال نے آ کر کُچھ دستاویز عدالت کے مُنشی کو احترام سے سونپ دیئے اور سلام کر کے اپنی جگہ آ گئے۔مُنشی نے کاغذات مجسٹریٹ کو پیش کیے۔عدالت میں کئی لوگ موجود تھے۔کُچھ مقدمے سے وابستہ تھے اور کُچھ تماشائی..... غالب کی نگاہیں ایک عبارت لکھ رہی تھیں۔

'' آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذِلّت سے خوش ہوتا ہوں۔خُود سے کہتا ہوں، لو! غالب کے ایک اور جُوتی لگی.... بہُت اِتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوُں، آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں۔ لے! اب تو قرضداروں کو جواب دے، کُچھ تو اُکسو، کُچھ تو بولو۔بولے کیا بے حیا۔بے غیرت! ...کوٹھی سے شراب۔گندھی سے گلاب۔ بزاز سے کپڑا۔ میوہ فروش سے آم۔ صراف سے دام..... قرض پہ قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا، کہاں سے دُوں گا؟''

قرضداروں سے تو بری ہو گئے مرزا۔لیکن قرض کی عادت سے چھوٹے نہیں تھے کہ جُوئے کی عادت میں پکڑے گئے۔

9

مرزا جوا کھیلنے سے باز نہ آئے۔ گھر کے باہر چوپال یا کسی چبوترے پر بیٹھتے اور چوسر بچھادی جاتی۔
حافظ، غالب کی غزل گاتا ہوا بازار سے گذر رہا تھا۔

کوئی دِن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کُچھ اب کی سرگرانی اور ہے

دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کُچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

ہوچکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

چودہ

1

مرزا غالب کو جُوئے کے جُرم میں جیل ہوگئی۔ گھر سے اُن کے لیے کھانا بھیجا جار ہا تھا۔ امراؤ بیگم کلّو میاں کو ہدایت دے رہی تھیں۔ وفادار پاس ہی تھی۔

'' کچھ شامی کباب ضرور رکھ لینا کلّو میاں! بہُت شوق سے کھاتے ہیں۔ قید خانے میں بھوک بھی کہاں لگتی ہوگی۔ پڑے رہتے ہوں گے سارا دِن۔''

کلّو میاں بتا رہے تھے۔

''بس پڑھتے رہتے ہیں یا لکھتے رہتے ہیں سارا دِن۔ نواب شیفتہ ہر دوسرے دِن ملنے جاتے ہیں۔''

'' شراب تو نہ ملتی ہوگی اُنہیں؟''

کلّو نے کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ ہدایت دے کر امراؤ بیگم آنگن میں آ گئیں۔ ایک کھاٹ پر لالائن، لالہ بنسی دھر کی بیوی بیٹھی تھیں۔ کنگھی تیل لے کر امراؤ کے اِنتظار میں۔ امراؤ بیگم روتے روتے کنگھی کروانے بیٹھ گئیں۔ لالائین نے ڈھارس دلائی۔

'' اب بس بھی کرو۔ صبح سے ایسے ہی گھوم رہی ہو۔''

لالائین نے چٹیا کھول دی۔

'' اب صبر کرو۔ بس روتی رہتی ہو ہر وقت۔''

'' مجھے اُسی روز سے معلوم تھا جب سے اُن نئے نئے امیرزادوں سے دوستی ہوئی تھی۔''

'' کون ہیں یہ امیرزادے؟''

'' چاندنی چوک کے جوہریوں کے لڑکے۔ دِن رات اُوپر بیٹھے جُوا کھیلتے تھے۔ میں نے ٹوکا تو جھڑک دیا مُجھے۔''

اور امراؤ بیگم نے گذشتہ دِنوں کا واقعہ سُنایا۔

ہوُا یوں تھا کہ مِرزا اُوپر جارہے تھے۔ امراؤ نے ٹوکا تو بگڑ گئے۔

'' میں تھوڑا ہی کھیل رہا ہوُں۔ اور لوگ کھیل میں کوئی شرط بدلیں تو میں کیوں منع کرنے چلا۔''

امراؤ سمجھانے لگی تھیں۔

'' مرزا فانی کوتوال تھے تو کوئی فکر نہ تھی آپ کو۔ یہ جو نئے آئے ہیں فیض الحسن۔ سخت عداوت رکھتے ہیں آپ سے۔ کسی روز خدانہ کرے........''

مرزا چڑ گئے۔

'' نہیں کرے گا خدا۔ اِس سے پہلے بھی وہ سب کچھ نہ کیا اُس نے۔ جو تم چاہتی تھیں۔ تمہارے ساتھ جو بہت بنتی ہے خدا کی، میں جانتا ہوں۔''

مرزا اُوپر چلے گئے۔

آنگن میں امراؤ بیگم بیٹھی تھیں اور لالہ بنسی دھر کی بیوی اُن کی کنگھی کر رہی تھیں۔ امراؤ نے آنکھیں پونچھ کر لالائین سے کہا۔

'' اُس کے اگلے دِن ہی کی بات ہے، میں اندر بیٹھک میں تھی کہ چھاپا پڑا۔ بہت سارے سپاہی ساتھ لے کر کوتوال آدھمکا۔ اور سیدھے اُوپر کے کمرے میں چڑھ گیا۔ وفادار بھاگی بھاگی اندر آئی۔''

وفادار جب بھاگی بھاگی اندر آئی تو امراؤ بیگم کچھ کام کر رہی تھیں۔ وفادار کی ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔

'' بیگم۔ بیگم صاحبہ! حضور کی ٹوپی چوغا........ وہ لوگ اُنہیں کوتوالی لے کر جا رہے ہیں۔''

امراؤ چونک گئیں۔

'' کون لوگ؟''

'' کوتوال ہیں شاید... وہ لوگ جُوا کھیل رہے تھے۔ اُنہیں پکڑ لیا سپاہیوں نے۔ حضور سے کہتے ہیں وہ گھر میں جُوا خانہ چلاتے ہیں۔ اِس لیے اُنہیں بھی کوتوالی چلنا ہوگا۔''

امراؤ کا دِل بیٹھ گیا تھا سُن کر۔

'' اللہ......''

وفادار مرزا کا چوغا ٹوپی لے کر چلی گئی۔

امراؤ بیگم کے بال سنوارتے ہُوئے لالائین نے بھروسہ دِلایا۔

'' تُمہارے بھائی صاحب گئے ہیں۔ ضرور کوشش کریں گے۔ چھڑوا لائیں گے اُنہیں۔ ضرورت پڑی تو قلعہ تک جائیں گے۔''

2

بادشاہ بہادُر شاہ ظفر اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں بیٹھے تھے۔اُن کے پاس اُن کا ایک مُشیر کھڑا تھا۔
اُنہوں نے ایک خط مُشیر کو دیتے ہوئے کہا۔

''یہ خط کنور وزیر علی مجسٹریٹ کے ہاتھ میں دینا۔اور کہنا ہماری ذاتی خواہش ہے کہ مرزا نوشہ کو کوئی سزا نہ دی جائے اور باعزّت رہا کر دیا جائے۔''

مُشیر نے خط لے لیا۔

'' برطانوی ریذیڈنٹ سے ہم خود سفارش کریں گے کہ وہ مرزا نوشہ کو بری کروا دیں۔''

مُشیر خط لے کر چلا گیا۔اِتنے میں چوبدار نے آ کر خبر کی۔

'' ظِلِّ سبحانی! مولانا نصیرالدین باریابی کی اِجازت چاہتے ہیں۔''

بادشاہ نے چوبدار کو کہا۔

'' آنے دو بھئی! کالے میاں ہمارے پیر ہیں۔''

کالے لباس میں کالے میاں اندر آ گئے اُن کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔

'' اللہ ہو! اللہ ہو!''

کالے میاں نے تسبیح بادشاہ سلامت کی پیشانی سے چھو کر اُنہیں دُعا دی۔

'' تشریف رکھیے مولئے۔''

'' سُنا ہے مرزا نوشہ کے لیے کچھ پریشان ہیں آپ؟''

'' جی ہاں! کوتوالِ شہر نے قید خانے میں بند کر دیا ہے اُنہیں۔ جُوئے کی بلا میں پکڑے گئے ہیں۔ وہ شاعر تو باکمال ہیں! کالے میاں! لیکن جُوئے شراب کی لت بُری لگی ہے اُنہیں۔''

'' طبعیت بہُت شاہانہ ہے اُن کی! وسیلے نہیں ہیں۔اِس لیے بدنام ہو گئے۔آپ کا وہ شعر اُن پر خُوب موزوں ہوتا ہے۔''

یا مُجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

بادشاہ نے اگلا شعر پیش کیا۔

خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مُجھے
کاش خاکِ درِ جاناں ناں بنایا ہوتا

"ہمارا بس چلتا پیر صاحب! تو مرزا نوشہ کو دربار میں بُلا لیتے، اپنے پاس رکھ لیتے ......لیکن کیا کریں۔ اوّل تو وہ دربار ہی نہ رہا۔ دوئم، اُستاد ذوق کے ہوتے ہوئے، خُود کو مجبور محسوس کرتے ہیں۔"

"کوئی راستہ نِکالیے جس سے اُن کی آمدنی بنی رہے اور ایسی ذِلّت نہ اُٹھانی پڑے۔"

"غالب ملک الشعراء سے کم کوئی سمجھوتہ نہ کرے گا۔ دُوسرے درجے کی کوئی بات اُسے منظور نہ ہوگی۔"

"فارسی کا اُستاد ہے۔ اُس سے خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھوایئے۔ اُس کا درجہ بھی بنا رہے گا اور عزّت بھی!"

بادشاہ سلامت سوچ میں پڑ گئے۔

"سارا شہر دِلّی اِس بات سے گونج رہا ہے کہ مرزا غالب حوالات میں بند ہیں۔ بتایئے یہ کسی ادنیٰ جُواری کا تذکرہ ہے یا کِسی عظیم شاعر کا؟"

3

غالب زنداں میں بند شعر کہہ رہے تھے۔

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک، ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

حضرت ناصح گر آویں دیدہ و دِل فرشِ راہ
کوئی مُجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

4

غالب کی قید سے ساری دِلّی ناراض تھی۔ مگر مُلک الشعراء۔ حضرت ذوق کی کوٹھی میں خوشی کا ماحول تھا۔ حضرت یاس اپنی خوشی دبا نہ سکے۔ ہاں ذوق سنجیدہ ضرور تھے۔ پاس میں ذوق کے کئی شاگرد .... جو مرزا غالب سے خار کھائے ہوئے تھے، وہ آپس میں جملہ بازی کرنے سے باز نہ آئے۔

" ہمیں تو معلوم تھا۔ سیانا کوّا آخر وہیں گرے گا، جہاں پر ...."

" جہاں کی اینٹ وہیں جا کے لگے گی۔ اور کیا؟"

" آپ خوامخواہ پریشان نہ ہوں اُستادِ محترم!"

ذوق نے آہ بھری اور فرمایا۔

" ہمیں افسوس ہے کہ مرزا غالب کو ایک ادنیٰ کوتوال کے ہاتھوں اِس طرح خوار ہونا پڑا .... لیکن اُس سے زیادہ افسوس ہوا۔ جب بادشاہ ظفر کو ایک جُواری کی خاطر ایک ادنیٰ فرنگی سے درخواست کرنی پڑی۔ اور وہ بھی نامنظور ہوگئی۔ .... اور تو اور مُنصفِ عدالت کنور وزیر علی خاں نے بھی بادشاہ سلامت کا لحاظ نہ کیا۔ ......"

محفِل سُن رہی تھی۔

" ......اور مرزا کو چھ ماہ قید بامُشقت اور دو سو روپیہ جُرمانے کا فیصلہ سُنا دیا۔"

سبھی نے صبر سے خبر سُنی اور اُن کی باچھیں کِھل گئیں۔

5

مرزا غالب جیل میں اپنی غزل پوری کر رہے تھے۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یُوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زادِ زُلف ہیں ، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا ، زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ہے اب اِس معمورے میں قحطِ غمِ اُلفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہیں کھاویں گے کیا؟

6

کوتوال فیض الحسن صاحب جب کوتوالی کے دفتر میں وارد ہوئے تو حکیم مومن اُن کے اِنتظار میں باہر بیٹھے تھے۔ مومن اُٹھے اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔

"میں حاضر ہوسکتا ہوں؟"

"آیئے آیئے حکیم صاحب تشریف رکھیے۔ آپ پھر اُسی قیدی کے سِلسِلے میں آئے ہوں گے۔"

"جی ہاں غالب سے ہی ملنے آیا ہوں..... لیکن آپ کے نام بھی ایک خط ہے۔"

کوتوال نے طنزیہ کہا۔

"اِس بار کس کی سِفارشی چِھٹی ہے؟"

حکیم مومن نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"ڈاکٹر راس ! .... پچھلی بار نواب شیفتہ کے ساتھ آئے تھے غالب سے ملنے۔"

کوتوال نے کُرسی کی پُشت پر پیٹھ ٹکاتے ہوئے اپنی مجبوری جتائی۔

"دو باتیں میں آپ پر واضح کردوں حکیم مومن صاحب۔ اوّل تو یہ کہ اُن کی رہائی میرے ہاتھ میں نہیں۔ اُن کی گرفتاری ضرور میرے ہاتھ میں تھی کیونکہ جُوا کھیلنا قانوناً جُرم ہے۔ اور مجرم کو پکڑنا میرا فرض ہے۔ لیکن رہائی ......اُنہیں صرف عدالت ہی سے مِل سکتی ہے۔"

حکیم نے سر ہلا کر اُن کی تائید کی۔

"اور دُوسری بات؟"

" دُوسری یہ کہ اُن کی قید چھ ماہ با مشقت تھی۔ بادشاہ سلامت کے کہنے پر بھی ہم اُنہیں رہا نہ کر سکے۔ لیکن مشقت معاف کر دی۔ قید صرف نظر بندی ہی رہ گئی۔ کھانا کپڑا سب گھر سے آ جاتا ہے۔ دوست احباب کے ملنے پر کوئی خاص پابندی نہیں۔ صرف وقت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اِس سے زیادہ اور کون سی آسائش ایک قیدی کو مہیا کی جا سکتی ہے؟"

" قید بہر حال قید ہے کوتوال صاحب۔"

کوتوال نے تیکھی نگاہ سے مومن کو دیکھا۔

" اچھا؟ ایک شرابی اور جُواری سے اِتنا لگاؤ کیوں ہے نواب صاحب کو؟ یہ نسبت اُن کے شانِ شایان نہیں ہے۔"

" دیکھئے کوتوال صاحب! غالب نے کبھی کسی پارسائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ نواب صاحب کی عقیدت غالب کے فضل و کمال کی بنا پر ہے۔ وہ اِس دَور کا بہت بڑا شاعر ہے....... شراب پینے اور جُوا کھیلنے سے وہ شاعر چھوٹا نہیں ہو جاتا۔"

مومن کچھ دیر رُکے۔ اور پھر بات آگے بڑھائی۔

" اور جہاں تک اِس نِسبت کا سوال ہے، اللہ نے چاہا تو تواریخ آپ دونوں کا ہی ذِکر کرے گی۔ صرف اِس لیے کہ آپ دونوں حضرات کسی نہ کسی شکل میں غالب سے منسوب ہیں"

مومن نے ڈاکٹر راس کا خط اُنہیں پکڑا دیا۔ کوتوال نے بے رُخی سے خط لیا اور کہا۔

" دیکھیے جیل کے مجرموں پر اگر تواریخ لکھی گئی تو شاید......."

کوتوال نے خط کھولا اور اُسے پڑھنے لگا۔

" ڈاکٹر راس نے ایک عرضی عدالت میں داخل کی ہے کہ مرزا کی طبیعت قید خانے میں اکثر ناساز رہتی ہے۔.....اور ایک خط آپ کے نام کہ آپ اِس کی تائید کریں۔"

کوتوال مومن کی طرف مڑا اور غُصے میں جواب دیا۔

" مُجھ سے کیوں جھوٹ بلوانا چاہتے ہیں آپ؟ کیا تکلیف ہے اُنہیں؟ اچھے خاصے ہیں۔ ہٹے کٹے ہیں اور بڑے خوش رہتے ہیں۔ مجھے تو افسوس اِس بات کا ہے کہ اُنہیں کبھی غمزدہ نہیں دیکھا۔"

حکیم مومن اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

7

غالب اچھے بھلے تھے۔ چہرے پر کوئی تناؤ نہیں۔ مزاج میں کوئی بھٹکاؤ نہیں۔ مرزا غالب اپنی کوٹھری میں کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اُن کے آس پاس بہت ساری کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔

اِتنے میں کسی کے سسکنے کی آواز آئی۔ مرزا کے مطالعہ میں خلل پڑا۔ آواز بند ہوگئی اور مرزا پھر اپنی کتاب میں کھو گئے۔ پھر وہی سسکنا۔ مرزا نے کتاب بند کردی۔ اُنہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ پتہ کریں ماجرا کیا ہے؟ گلیارے میں ایک سپاہی آتا ہوا نظر آ گیا۔ مرزا نے اشارہ کر کے اُسے بُلایا۔

" سُنو ...... اِدھر آؤ۔"

سپاہی خُوشی خُوشی اُن کی کوٹھری کی طرف آیا۔ کوٹھری کا دروازہ کھُلا تھا۔ وہ اندر آ گیا۔

" فرمایئے!"

" یہ کون رو رہا ہے؟ صُبح سے کئی بار سُن چُکا ہوں۔"

" ایک جواں سال لڑکا ہے، حضُور! کسی جُرم میں پکڑا گیا ہے حُضور۔ تین مہینے کی قید کی سزا سُنا دی گئی ہے۔ اکیلا بند کردیا گیا ہے کوٹھری میں۔"

" اچھا...... تو تنہائی برداشت نہیں ہوتی اُس سے۔"

" جی!"

" ٹھیک ہے، جاؤ !"

" ایک شعر پیش کروں؟ عرض کیا ہے.........."

غالب نے سختی سے منع کیا۔

" جاؤ ...... یہ شعر پڑھنے کا وقت نہیں ہے۔"

سپاہی سلام بجا کر چلا گیا۔ غالب نے پھر کتاب کھولی۔ ابھی ایک پنا ہی پلٹا تھا کہ پھر سسکنے کی آواز آئی۔ غالب اُٹھے، اپنی چھڑی سنبھالی اور کوٹھری کا دروازہ کھول کر گلیارے میں آ گئے۔

اب آواز نزدیک سے آنے لگی۔ وہ اُس کوٹھری کے پاس آئے اور دیکھا روتے ہُوئے قیدی کو جو ایک کوٹھری میں بند تھا اور اُس کے سلاخوں والے دروازے پر بڑا سا تالا لگا ہُوا تھا۔ مرزا نے قیدی کی طرف دیکھا۔

" کیوں میاں۔ کیا ہُوا ؟"

لڑکے نے رُندھی آواز میں جواب دیا۔

" قید ہوگئی۔ تین ماہ کی۔"

" ہُوں...... تو رو کیوں رہے ہو؟"

لڑکے نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

" آج میری شادی ہونے والی تھی۔"

غالب مُسکرا دیے۔
'' عمر قید سے بچ گئے۔ .... تین ماہ کی نہ ہوتی .... تو عمر قید ہو جاتی .... اللہ بڑا کارساز ہے۔
میاں شُکر بجا لاؤ اُس کا کہ اِس کوتوال فیض الحسن کے ہاتھوں ایک اور بھلا کام کروا دیا۔ اس قید سے تو بہر حال چھوٹ جاؤ گے........ اُس قید سے کبھی نہ چھوٹتے۔''
لڑکے کی سِسکیاں بند ہو گئیں۔ وہ غالب کو دیکھتا رہ گیا۔ مِرزا اُٹھے نہیں واپس اپنی کوٹھری میں آ گئے۔

8

مِرزا کئی دِنوں سے قید میں تھے لیکن اُن کے گھر میں اُن کی ہر یاد۔ اُن کی ہر چیز کو سنوارا جا تا تھا۔ وفادار اِس وقت وہی کر رہی تھی۔ اُن کے پڑھنے لکھنے کے کمرے کی صفائی ہو رہی تھی۔ کتابیں کاغذ سنبھال کر رکھے جا رہے تھے۔ باہر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے اوپر سے دیکھا کہ حاجی میر تشریف لائے تھے۔ دروازہ کھول کر، وفادار اُوپر لوٹ آئی، تُتلا کے وفادار نے خبر کی۔
'' بیگم صاحبہ!''
'' کیا ہے وفادار؟''
'' حاجی میر آئے ہیں۔ آپ سے کُچھ گفتگو کرنا ہے۔''
'' بلا لو۔''
'' اُوپر ہی بُلا لیتی ہوں۔ یہیں پردے سے بات کر لیجیے۔''
امراؤ بیگم نے حامی بھری۔
'' اُوپر تشریف لائیے میر صاحب۔''
وفادار حاجی صاحب کو سیڑھیاں چڑھا کر اُوپر لے آئیں اور وہیں ایک دیوار کی اُوٹ سے اُن کی بات ہوئی۔
''تسلیم عرض کرتا ہوں بیگم صاحبہ! مِرزا نوشہ، ناچیز کو حاجی میر کے نام سے جانتے ہیں۔....... کُتب فروشی کی دُکان ہے میری۔''
'' میں جانتی ہوں میر صاحب! آپ کی دُکان پر ہی دِن گُزارا کرتے ہیں اکثر! بہت تعریف کرتے ہیں آپ کی۔''
میر صاحب نے ماتھا چھو کر تعریف کے لیے شُکریہ ادا کیا۔

'' بندہ کس قابل ہے۔ .... میں حاضر ہوا تھا یہ خبر دینے کہ مرزا نوشہ کے دیوان کا ایک نسخہ، جو آگرہ سے لکھ کر آیا تھا۔ میرے ہاں پڑا تھا۔ وہ چھپنے چلا گیا ہے۔ اور کچھ بیانہ، جو میں حاصل کر سکا۔ پیش کیے جاتا ہوں .... شاید وقت ضرورت کام آئے۔''

امراؤ بیگم نے فراغت کی سانس لی۔ کچھ دیوان کے چھپنے کی خبر سن کر، کچھ بیانہ کی بات سن کر۔ یہ دونوں خبریں اُن کے لیے خوشی لے کر آئی تھیں۔

'' شکریہ حاجی صاحب۔ اللہ آپ کو سارے ثواب بخشے۔''

امراؤ بیگم نے وفادار کو آواز دی جو پاس ہی کھڑی تھی۔

'' وفادار! حاجی صاحب سے روپیہ لے لو۔''

پھر اُنہوں نے حاجی صاحب کو بتایا۔

'' میاں جی دو تین ماہ سے .... گھر پہ نہیں ہیں، آپ جانتے ہیں۔''

حاجی میر ساری داستاں جانتے تھے۔

'' جی ہاں! ڈاکٹر راس۔ دِلّی کے سرکاری سول سرجن ہیں۔ نام یافتہ جراح اور طبیب ہیں..... نواب شیفتہ اب اُن کی سفارش لے کر گئے ہیں......... شاید فرنگی ریذیڈنٹ مان جائیں اور دو ایک روز میں رہا کر دیں صاحب کو۔''

امراؤ بیگم زیادہ بول نہ پائیں۔

'' خُدا کرے....... وہ گھر لوٹ آئیں بس..... پھر جو جی آئے کریں۔''

حاجی میر نے اِجازت چاہی۔

'' اِجازت چاہوں گا۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور یاد فرمایئے گا۔ خُدا حافظ۔''

حاجی صاحب چل دیے۔ سیڑھیاں اُترنے کی آواز آئی پھر باہر جانے کی۔ اب جا کر امراؤ بیگم نے وفادار کو ضروری ہدایت دی۔

'' وفادار! جاؤ، کچھ سودا سلف اُٹھا لاؤ بنیے سے۔ اور کلّو میاں کہاں ہیں؟''

'' دھوبی کے یہاں گیا تھا۔ ابھی تک لوٹا نہیں۔''

یہ بیانہ کام آیا۔ گھر میں اناج رسد ختم ہوئی جا رہی تھی۔ اِس بیچ وہ آ جائیں تو اب کوئی پریشانی نہ ہو گی۔ وفادار بنیے کے یہاں گئی اور امراؤ کچھ کپڑے اُٹھا کر آنگن کی طرف چل پڑی۔ آنگن میں کپڑے رکھ کر مڑی ہی تھی کہ سامنے تخت پر کسی کو بیٹھا پایا۔ مرزا تھے۔ چھڑی پر دونوں ہاتھ ٹکے تھے اور ہاتھوں کے اُوپر سر رکھا تھا۔ وہ پاس بیٹھ گئی اور اچانک پھپھک کے رو پڑیں۔ اُن کا سر مرزا کی پیٹھ پر تھا۔ اُن کی ہچکیوں سے مرزا کا تن بدن کانپ رہا تھا۔

پَنَدرَہ

1

تفتہ کے گھر میں آم دعوت تھی۔ سبھی حضرات آج کے دِن صرف آم کھانے کے لیے مدعو تھے اور میز بان تھے ہرگوپال تفتہ اور اُن کی بیگم، کوشلیا۔ مرزا غالب اپنے زندان کے تاثرات سُنا رہے تھے۔

'' سب سے بڑا خطرہ تو یہی تھا کہ اِن قید کے چھ مہینوں میں کہیں ایسا نہ ہو کہ آموں کا موسم آئے اور گزر بھی جائے۔''

سبھی مہماں ہنس پڑے۔

'' میرے جُرم تو بہر حال اُوپر جا کے بھی مُعاف ہو جاتے۔ لیکن وہ کیا کہتے ہیں مُنصف کو، مجسٹریٹ کے یہ جُرم میں کبھی مُعاف نہ کرتا۔''

اِتنے میں کوشلیا آ گئیں اور مرزا سے پوچھا۔

'' بھائی صاحب! خاص کُچھ اور بھجوا دوں؟''

'' نہیں کوشلیا! جب آم ہوں، تو خاص کی کوئی ضرورت نہیں۔''

کوشلیا چلی گئی اور نواب شیفتہ نے بات چیت کا مدعا پھر قید کے تاثرات کی طرف موڑ دِیا۔

'' لیکن کوتوال نے ایک لحاظ تو ضرور کیا کہ آپ کی قید چھ ماہ با مشقت تھی۔ آپ سے مشقت نہیں کرائی۔ وہ مُعاف کر دی۔''

'' ایک ماہ تو با مشقت رہی صاحب۔ روز پانچ کوڑے پڑتے تھے۔''

حیران ہو کر تفتہ نے پوچھا۔

'' کوڑے؟ ''

سبھی نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ غالب بڑے چاؤ سے آم چوس رہے تھے۔ شیفتہ کو یقین نہیں ہوا۔

'' کوڑے پڑتے تھے، یہ تو ..... ناممکن ہے مرزا۔''

مرزا نے سمجھایا۔

'' اجی صاحب! ایک سپاہی جسے ہماری نگرانی کے لیے مقرر کیا گیا تھا، کُچھ شاعرانہ مزاج کے نکلے۔ ہر روز اپنے پانچ شعر سُنایا کرتے تھے، اور داد چاہتے تھے۔ ..... ایک ایک شعر ایک ایک کوڑے کی طرح پڑتا تھا میری پیٹھ پر .... ایک مہینے میں میری کھال اُدھیڑ دی اِن حضرت نے۔''

غالب کی لطیفہ بازی میں سبھی کو مزا آ رہا تھا۔ تفتہ نے آگے بات بڑھائی۔

'' پھر چھٹکارا کیسے مِلا؟''

'' داروغہ سے کہہ کے بڑی مُشکل سے تبدیلی کرائی اُس کی۔''

نوکر ہاتھ مُنہ دُھلانے کے لیے چِلمچی لے کر آیا۔ بڑی دیر سے ایک نوجوان پیچھے بیٹھے باتیں سُن رہے تھے۔ نواب شیفتہ نے مِلایا۔

'' مرزا نوشہ! اِس نوجوان کو آپ سے مِلانا چاہتا ہوں۔ بہت اچھا شعر کہتے ہیں۔ آپ کی شاگردی میں آنا چاہتے ہیں۔''

مرزا کے ہاتھ سے آم چھوٹ کر نیچے آ گرا۔ اُنہوں نے پوچھا نوجوان سے۔

''بامشقت! اور کتنے شعر پڑیں گے۔''

نوجوان جھینپ گیا۔ باقی لوگ ہنستے رہے۔ نوجوان نے شائستگی سے عرض کیا۔

'' میں آپ کا بہت بڑا مدّاح ہوں۔ دُور سے آیا ہوں۔ مجھے مایوس نہ کیجیے گا۔''

'' کہاں سے آئے ہو؟''

''میں پانی پت کا رہنے والا ہوں۔''

'' نام کیا ہے؟''

''الطاف حُسین۔''

'' اور تخلص؟''

'' حالی!''

غالب نے سر ہلایا۔ اور حامی بھری۔

'' حالی! اچھا ہے۔''

حالی مرزا غالب کے پاس آ کر دوزانو ہوئے۔ مرزا کے ہاتھ کا بوسہ لیا اور اُس ہاتھ کو ماتھے سے چھوا لیا۔ غالب نے بڑی شفقت سے کہا۔

" الطاف میاں! ایک آم۔"

" نہیں قبلہ!"

الطاف حُسین حالی، مرزا غالب کے سب سے ممتاز شاگرد کہلائے۔ یہ سُن کر غالب کا زمانہ اور نزدیک نظر آتا ہے کہ حالی، اِس دور کے ایک بہُت بڑے ادیب جناب خواجہ احمد عباس کے نانا تھے۔

2

جُمعرات کے دِن۔ 4 جُولائی 1850 عیسوی بہ مطابق 23 شعبان 1244 ہجری مرزا غالب بادشاہ بہادُر شاہ ظفر کے سامنے پیش ہوئے۔

لال قلعہ۔ دربارِ مُغلیہ۔ بہادُر شاہ ظفر نے اِتنے برسوں بعد مرزا غالب کی قدر پہچانی اور عزت بخشی۔

" نجم الدّولہ، دبیر الملک، نظام جنگ۔ مرزا اسد اللہ خان غالب! .... ہم اِس دربارِ شاہی میں آپ کا اِستقبال کرتے ہیں۔"

ذوق، کالے میاں، مُفتی صاحب اور دیگر شاعر اور سُخن ور موجود تھے۔ مرزا کو خلعت عطا کی گئی۔ دوشالہ اوڑھایا گیا۔ لال و جواہر سے نوازا گیا۔ کالے میاں اُٹھے۔ دُعا میں ہاتھ اُٹھائے۔ اُن کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔

" اللہ ہُو ۔ اللہ ہُو "

مُفتی صدرالدین نے مرزا غالب کو گلے لگایا۔

3

مرزا قلعہ سے سیدھے گلی قاسم جان آ گئے اور ساری تفصیل بیگم کو سُنا دی۔

" اب تو خوش ہو جاؤ بیگم! تمہاری دعائیں قُبول ہوئیں۔"

" صرف خطاب ہی دیا۔ دبیر الدولہ۔ عملی۔"

مرزا ٹھہرے زمانہ بھر کے اُستاد! بیگم کی غلطی سُدھار دی۔

" اُونہوں! نجم الدولہ ۔ دبیر الملک۔ نظامِ جنگ......."

" مگر صرف خطاب ہی دیا یا ....کچھ نقد بھی ؟"

مرزا نے سمجھایا۔

" بھئی! چھ پارچے دیے۔اور تین رقم جواہر خلعت پہنایا ...... اور خاندانِ تیموریہ کی تواریخ لکھنے کی ذمہ داری دی ہے۔کوئی تیموری انداز کا وظیفہ بھی مل جائے گا۔"

" ....اور اگر نہ مِلا ؟"

مرزا ہنس پڑے۔

" تو ہم تواریخ بدل دیں گے۔"

امراؤ کی آنکھوں میں کئی سوال اُبھر آئے۔

" وہی کریں گے جو'شاہنامہ' لکھتے ہوئے فردوسی نے محمود غزنوی کے ساتھ کیا تھا .... اب کوئی شاعر کے مُنہ لگے گا .... تو یہی ہوگا۔"

مرزا کی یہی ادا بیگم کو پسند تھی۔ بچپن میں بھی یہی تیور تھے۔ حالات سے لوہا لینے کے۔

" وہ باشاہ (بادشاہ) ہیں تلوار کے۔ہم قلم کے شہنشاہ ہیں۔اُن کا مُلک چھن سکتا ہے۔ہماری مِلکیت کوئی نہیں چھین سکتا۔"

امراؤ بیگم نے دِل ہی دِل میں 'آمین' کہا۔

" میں ذرا مرزا یوسف سے مِل آؤں!"

وہ چل پڑے۔امراؤ اُنہیں نہارتی رہی۔

4

مرزا یوسف کو پاس ہی مکان دلوادیا تھا مرزا نے۔ جہاں آج کل وہ اپنے خاندانی نوکر کلیان کے ساتھ اکیلے رہتے تھے۔ بیگم اور بچے اُنہیں چھوڑ کر جے پور چلے گئے تھے۔ غالب مکان میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ

یوسف میاں کے ہاتھ میں پتنگ کے ڈور کی چرخی تھی اور ڈور ایک چوہے کی دُم سے باندھی گئی تھی۔ چوہا بھاگتا تو یوسف میاں ڈور چھوڑتے۔ پھر کھینچ کر ڈور چرخی میں لپیٹتے اور چوہا اُن کے پاس کھنچا چلا آتا۔ اور کلیان بمشکل اُنہیں دال چاول کھلا رہے تھے۔ غالب نے سارا ماجرہ دیکھ کر کلیان سے پوچھا۔

'' کلیان! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

'' حُضور کیا کریں۔ جب تک یہ نہ کریں یوسف خان کھانا نہیں کھاتے۔''

غالب چھوٹے بھائی کے قریب آ گئے اور پوچھا۔

'' یوسف میاں! آپ کے بیوی بچوں کو بُلا لیں جے پور سے؟''

یوسف میاں کُچھ نہیں بولے اِنکار میں سر ہلا دیا۔

'' بچے یاد آتے ہیں آپ کو؟''

پھر وہی اِنکار 'نہ'۔ مرزا نے کلیان سے پوچھا۔

'' کیسی طبیعت ہے اِن کی؟''

'' حکیم صاحب روز آ کے دیکھ جاتے ہیں۔ لیکن کوئی فائدہ نظر تو نہیں آتا ہے حُضور!''

یوسف میاں چوہے کے پیچھے بھاگتے بھاگتے باہر چلے گئے۔ مرزا نے بھائی کو پُکارا۔

'' ارے یوسف! کہاں چلے یوسف؟''

لیکن یوسف میاں اندر نہیں آئے۔ غالب نے کلیان کو ہدایت دی۔

'' باہر مت جانے دیا کرو اِن کو، کلیان! مجھے تو ڈر ہی لگا رہتا ہے۔ اپنے ساتھ رکھ لیتا لیکن .... عارف کے دونوں بچے حُسین اور باقر کو بُلوایا ہے۔ اب وہ میرے ساتھ رہیں گے، اِس لیے۔''

مرزا نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ روپے نکال لیے اور کلیان کو دے دیے۔

'' یہ کُچھ روپے رکھ لو۔ کام آئیں گے......''

اُسی وقت ہانپتے ہانپتے حالی اندر آئے۔

'' حُضور کے ہاں حاضر ہوا تھا۔ خبر ملی آپ یہاں ہیں۔''

'' اِس طرح کیوں ہانپ رہے ہو؟''

'' ایک بُری خبر ہے حُضور!''

مرزا کو فکر ہوئی۔ پوچھا۔

'' کیا ہوا؟''

"اُستاد ذوق انتقال فرما گئے۔"
غالب کا چہرہ اُتر گیا۔
"اِنّا للہ وَاِنّا اِلیہ راجعون۔"

5

حضرت ذوق کا جنازہ چوک سے گذرا۔ غالب نے بھی کاندھا دیا۔ اور بھی شعراء تھے۔ مفتی۔ تفتہ۔ شیفتہ۔ حکیم مومن۔ مرزا غالب آگے آگے تھے۔ پس منظر میں حضرت ذوق مرحوم کی ایک مشہور غزل گونج رہی۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دُنیا سے دِل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دِل لگی چلے

دُنیا نے کِس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یُونہی، جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اِس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

6

زندگی پھر اپنے ڈھرے پہ آ گئی پھر آموں کا موسم آیا۔ اور اب کی بار جو بچے کھچے دوست یار تھے۔ مرزا نے اُنہیں بھی اپنے یہاں بُلوایا تھا۔ گلی جیسے بند کر دی گئی ہو۔

گلی قاسم جان میں گھر کے دروازے کے باہر کچھ چارپائیاں بچھی تھیں۔ کچھ ایک موڑے تھے اور نوکر نے ایک بالٹی بھر آم سامنے رکھ دیے۔ حاجی میر نے آم چھیلتے ہوئے کہا۔

'' بھئی ! آم میٹھے تو ہیں۔''

نواب شیفتہ نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

'' بقول مرزا ۔ آم میں دو خُوبیاں ضروری ہیں۔ میٹھے ہُوں اور بہت ہُوں''

سبھی دوست آم کھا رہے تھے۔ مرزا صاحب، حاجی میر، نواب شیفتہ، ہرگوپال تفتہ، مومن، مُفتی صدرالدین اور نوجوان شاعر حالی لیکن حکیم رضی الدین نے ایک بھی آم کو ہاتھ نہ لگایا۔ وہ شربت پی رہے تھے۔ غالب نے پھر پیش کش کی۔

'' ارے بھائی حکیم صاحب ایک آم تو چکھ لیجیے۔''

'' میں آم نہیں کھاتا بھائی! شکریہ۔ میں اپنے شربت سے خوش ہُوں۔''

حاجی میر نے ایک اور موضوع اُٹھایا۔

'' آپ کا دِیوان تو خوب مقبول ہُوا مرزا صاحب۔ سُنا ہے دُوسری اشاعت کی تیاریاں ہو رہی ہیں لکھنؤ میں۔''

حالی کو سُن کر بہُت اچھا لگا۔ اُس نے کہا۔

'' نواب واجد علی شاہ۔ سُنا ہے، اشرفیوں میں تُلوا رہے ہیں۔''

غالب کو کُچھ اور سُوجھا اور کہا۔

'' وہ تو اچھا کر رہے ہیں۔ لیکن تُلوا کے 'دِیوان' وہ رکھ لیں اور اشرفیاں مُجھے بھیج دیں تو اور اچھا ہے۔''

سبھی ہنس پڑے۔ نواب شیفتہ کی نظر مُفتی صدرالدین پر پڑی۔ اُنہیں ہنسی آ گئی۔ مُفتی صاحب کی داڑھی میں آم کا رس لگا ہوا تھا۔ اُنہوں نے مذاق کیا۔

" بھئی مُفتی صاحب! آپ نے آم کی مہندی خُوب لگائی۔"
غالب نے بھی یہ منظر دیکھا۔
" بھئی مُفتی صاحب آپ پہ بُڑھاپا نہ آیا۔ آپ کے بال تو اِتنے ہی سفید ہیں جتنے جوانی میں تھے۔ اعمال کے باوجود کالے نہ پڑے۔"
مرزا غالب کی پھبتی پر مُفتی صاحب بھی ہنس پڑے۔ اُنہیں اپنا یہ حاضر جواب دوست بہت ہی پسند تھا۔ اُنہوں نے مرزا صاحب سے التجا کی۔
" اچھا بھئی مرزا! کل جو باشاہ کے سامنے، گذارش پڑھی تم نے، وہ ہمیں لکھوادو۔"
حاجی میر صاحب وہاں موجود تھے۔ اُنہوں نے بھی اِصرار کیا۔
" بھئی وہ کیا تھی ہم بھی سُنیں!"
" کچھ نہیں حاجی صاحب! قلعہ کا دستُور ہے مُلازموں کی تنخواہ سال میں دو بار بنتی ہے۔ یعنی مُجھے بھی چھ ماہی ملے گی۔.........اب میں اپنی روز مرّہ کی ضرورتوں کا کیا کروں؟....... پھر وہی مہاجن اور مہاجن کا سُود۔ سو ہم نے بادشاہ سے ایک گذارش کی۔"
مفتی صاحب نے تعریف کی۔
" بھئی، وہیں کی وہیں فی البدیہہ کہہ دیا مرزا نے۔ ہمیں لکھنے تک کی مُہلت نہ دی۔"
باقی دوستوں نے بھی اِصرار کیا۔ حکیم صاحب نے پوچھا۔
" کیا فرمایا آپ نے، ہمیں بھی سُنائیے۔"
مرزا نے یاد کرنے کی کوشش کی۔
" اب سارے شعر تو یاد نہیں، کُچھ ایسے تھے۔"

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار

بارے نوکر بھی ہوگیا صد شکر
نسبتیں ہوگیئں مشخص چار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہوں میں اگرچہ نزار

شاید مرزا کچھ بھول رہے تھے۔ مفتی صاحب نے یاد دلایا۔

"ارے بھئی، سُود تو بھول گئے تم۔"

رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مُجھ کو دیکھو تو، ہُوں بقید حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار

اب مرزا غالب کی یاد ہری ہوگئی۔

کُچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کُچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دِن کو دُھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل ونہار

بس کہ لیتا ہوُں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سُود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہوگیا ہے شریک ساہوکار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

میری تنخواہ کیجیے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مُجھ کو زندگی دُشوار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوُں دن پچاس ہزار

واہ۔ واہ ہوئی۔ قہقہے لگے۔ مفتی نے بات آگے بڑھائی۔

"بادشاہ سلامت نے فوراً عرضی منظور کر لی۔"

سبھی نے مرزا کی ذہانت اور سمجھداری کی داد دی۔ اِسی اثنا میں ایک گدھے والا اپنے جانور کو ہانکتا ہوا وہاں آن پہنچا۔ حالی نے اُسے سمجھایا۔

"ارے بھائی جان! اُدھر کی گلی سے نکل جائیے۔ کیوں سب کو اُٹھوانا چاہتے ہیں آپ؟"

اِس بیچ گدھے نے آم کے چھلکے کو سُونگھا اور مُنہ پھیر لیا۔ حکیم صاحب یہ دیکھ رہے تھے۔

"مرزا دیکھا آپ نے....؟ گدھے نے آم کا چھلکا سُونگھ کے چھوڑ دیا.....آم تو گدھے بھی نہیں کھاتے۔

مرزا نے فوراً جواب دیا:

"جی ہاں۔ گدھے آم نہیں کھاتے۔"

ٹھہاکا لگا اور گلی گونج اٹھی۔ دُور کسی کے سرپٹ گھوڑا دوڑانے کی آواز آئی۔ سبھی نے دیکھا ایک گھوڑا سوار اُن کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔ پھر وہ سوار گھوڑے سے اُترا اور مجلس کی طرف بڑھا۔

غالب نے پہچانا۔ شمس تھا۔

"آؤ شمس بھائی!"

"آداب حضرات۔ کیسے ہو اسد بھائی؟"

شمس اسد کے برابر بیٹھ گیا۔

"کہو! کیسے آنا ہوا؟"

"اسد بھائی! اب تو آپ شاہی دربار میں پہنچ گئے۔ بادشاہ سلامت سے کہہ کے ہماری پینشن کا فیصلہ کرا دو۔"

"وہ معاملہ اُن کے ہاتھ میں نہیں ہے شمس!"

"اُن سے کہو کہ ریذیڈنٹ سے کہلوائیں۔ سارا معاملہ ولیم فریزر کے ہاتھ میں ہے۔ وہ چاہے تو ایک دِن میں ہماری پنشن کا فیصلہ کروا سکتا ہے۔"

غالب نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھو شمس! تمہارے اصرار پر میں کلکتہ تک گیا۔ خواہ مخواہ خوار ہوا......میں وہ معاملہ اب ہرگز نہیں اُٹھانا چاہتا...... ہاں، مجھ سے کوئی مالی مدد درکار ہو تو میں تیار ہوں۔"

شمس کو اِس جواب کی اُمید نہ تھی۔ اُس نے مرزا سے ہمیشہ من مانی کی تھی۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر ایکدم اُٹھ کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے اسد بھائی! ولیم فریزر سے میں خود ہی نپٹوں گا۔ خُدا حافظ۔"

اور شمس گھوڑے پر سوار چلا گیا۔

سولہ

1

رات کا وقت ۔ لال ٹین کی روشنی میں مرزا کچھ لکھ رہے تھے ۔ اِس میں کئی خطوط تھے، کچھ لفافوں میں بند ۔ کچھ بس تہہ کیے ہوئے ۔ کلّو بھی کچھ کاغذ تہہ کر رہا تھا ۔ غالب نے خط پُورا کیا اور کلّو میاں کو دے دیا ۔ کلّو نے خط ہاتھ میں لیا ۔
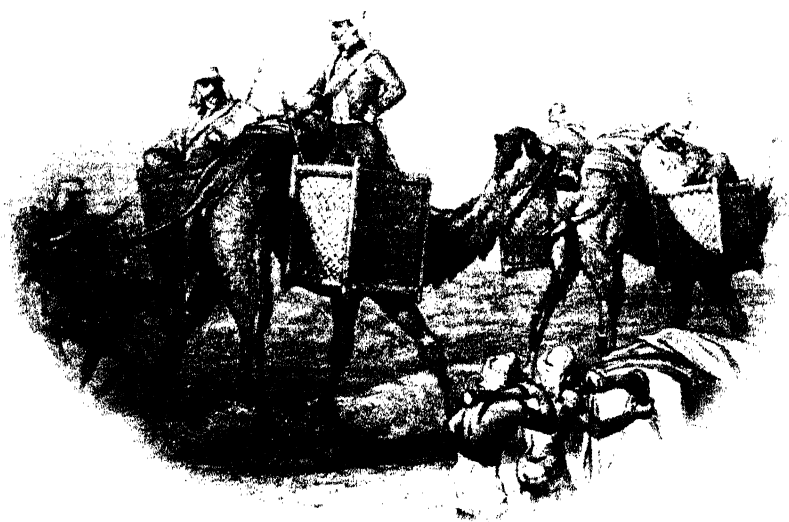
" دیکھو کلّو میاں! یہ خط ہے نہ، مُنشی جواہر سنگھ جوہر کے نام ۔ اِسے صبح ہی سُپردِ ڈاک کر آنا ۔ اور باقی کل شام لفافے بنالیں تو بھیج دیں گے .... کاغذ میں نے کاٹ لیے ہیں ۔ کل دونوں بیٹھ کر گوند سے چپکا دیں گے ۔

غالب نے دِل ہی دِل میں خط کی عبارت دہرائی ۔

" عزیزم جواہر سنگھ جوہر!

نیشا پور

مجھے ٹوپی کی حاجت نہیں ...... لُنگی بھیج دو جیسی پشاور اور مُلتان میں بنتی ہے ۔ لیکن ایسی لُنگی ہو کہ اُس کا رنگ شوخ اور انگشت نُما نہ ہو ۔ حاشیہ سُرخ نہ ہو اگر چہ باریک اور نفیس ہو ۔ لیکن سونے چاندی کے تار اُس میں نہ بُنے ہوئے ہوں ۔ ریشم سیاہ و سبز اور خاکستری اور زرد تلاش کریں اور مُہیا کر کے ڈاک سے مجھے بھیج دیں ۔ اور قیمت بھی لکھیں ۔ اگر قیمت نہیں لکھیں گے تو میں نہیں لینے کا لُنگی ۔ بھیجنے میں توقف اور قیمت لکھنے میں تکلف نہ کیا جائے ۔"

2

برطانوی فوج کی چار سپاہیوں کی ایک ٹکڑی ۔ ہتھکڑی لگے ایک مُجرم کو لیے جا رہی تھی ۔ حاجی میر دُکان میں تھے ۔ اُنہوں نے سارا ماجرہ دیکھا ۔ مُجرم اور کوئی نہیں، شمس تھا ۔ وہ شمس کو پہچانتے تھے ۔ یہ خبر جلد از جلد مرزا نوشہ تک پہنچ جانی چاہیے ۔ اُنہوں نے پڑوس کی دُکان میں بیٹھے ایاز سے کہا:

'' ایاز بھائی ذرا دُکان کا خیال رکھنا ! میں بس گیا اور آیا۔''

کچھ قدم چل کر وہ پھر رُک گئے اور ایاز کو ایک اور ہدایت دی۔

'' مرزا غالب آ جائیں تو رکنے کے لیے کہیے گا۔ میں اُنہیں کی تلاش میں جا رہا ہوں۔''

3

حاجی میر صاحب مرزا کے گھر گلی قاسم جان پہنچ گئے۔ وفادار کہیں باہر جا رہی تھی۔ اُسے پہچانتے تھے۔ اُس سے پوچھا۔

'' بی بی! سُنو''

اُنہیں پہچان کر وفادار رُک گئی۔

'' تسلیم علض کلتی (عرض کرتی) ہوں حاجی صاحب۔''

'' تسلیم بی بی! مرزا ہیں گھر پر۔''

''اجی کہاں؟ صبح سویرے نکل جاتے ہیں تیار ہو کے۔ بادشاہ سلامت قلعے میں جو بُلا لیتے ہیں۔ صلاح مشورے کی ضرورت پڑتی ہوگی۔''

'' اب وہاں تک ہماری رسائی نہیں...... مگر ......دوپہر کے کھانے پر تو لوٹیں گے شاید۔''

'' ہاں دوپہل (دوپہر) کو تو ضلول (ضرور) لوٹیں گے۔ باشا سلامت نے اُن کے لیے بیسنی لوٹی (روٹی) جو بھجوائی ہے۔ شاہی خادِم آئے تھے دینے کے لیے۔''

وفادار جتنا تُتلاتی تھی اُتنا ہی بتیاتی تھی۔

'' بہر حال۔ خُدا حافظ''

حاجی فِکر مند ہو کر لوٹ گئے۔

4

حاجی میر اپنی دُکان میں پہنچے تو حیران ہو گئے یہ دیکھ کر کہ دُکانیں بند کی جا رہی تھیں۔ سارا بازار بند تھا۔ ایک عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا ایاز میاں حاجی صاحب کی راہ دیکھ رہے تھے۔

'' کیا ہوا ایاز بھائی۔ سارا بازار بند کیوں ہے؟''

ایاز میاں بہت چڑے ہوئے تھے۔

'' میر صاحب یہ فرنگی وبا کی طرح پھیلتے جا رہے ہیں۔ یہ تاجر سوداگر نہیں ہیں۔ شیطان کے کارکن ہیں۔ اندر ہی اندر.....لگتا ہے ہندوستان کو گھن لگ گیا ہے۔ دیمک کی طرح پھیلتے جا رہے ہیں۔ سورج کو گرہن لگتے کبھی دیکھا ہے آپ نے؟ بالکل وہی ہو رہا ہے ہندوستان کے ساتھ۔''

ایاز اپنے آس پاس دیکھ رہے تھے کچھ دُور پر دو چار آدمی باتیں کرتے ہوئے جمع تھے۔

'' ہوا کیا ایاز میاں؟''

'' اجی صاحب! کوئی بات ہوئی۔ جب جس کو چاہا پکڑ لیا۔ جس کو چاہا گرفتار کر لیا...... یہ لوگ آخر ہوتے کون ہیں؟''

حاجی صاحب نے کچھ دیر پہلے شمس کو دیکھا تھا لیکن اُس کی گرفتاری کا بازار بند سے کیا تعلق؟ اُنہوں نے ایاز میاں سے پھر پوچھا۔

'' کسے گرفتار کیا انگریزوں نے؟''

ایاز میاں کا گلا بھر گیا۔ اور غصّے کے مارے اُن کا جی سُلگ رہا تھا۔

'' ہمارے نواب واجد علی شاہ کو گرفتار کر کے کلکتہ لے گئے۔ وہاں مٹیا برج میں بند کر دیا۔ یہ سالے، حرام کے تخم، ہوتے کون ہیں اُنہیں.......؟''

'' گرفتار کس نے کیا؟''

'' انگریزوں نے!''

"کیسے گرفتار کیا؟ مطلب سپاہی کون تھے؟"

"سپاہی۔ ہندوستانی اور کون؟"

حاجی میر جو پوچھنا چاہتے تھے اُس کا جواب ایاز نہ دے سکے۔ میر صاحب جاننا چاہتے تھے کہ کب جنگ چھڑی۔ کب نواب کی فوج ہار گئی اور کب ہارے ہوئے نواب کو پکڑا گیا۔ اگر وہاں جنگ چھڑی تو چنگاری کہیں اور بھی سُلگے گی۔ لیکن نہ کوئی جنگ کا اعلان ہوا۔ نہ جنگ چھڑی۔ نواب کی فوج نے کیسے بنا ایک بھی گولی داغے اپنے نواب کو گرفتار ہونے دیا۔ چنگاری تھی تو ایاز میاں کے دِل میں اور وہ سُلگ رہی تھی لگا تار........

"نواب واجد علی شاہ پہ ہاتھ ڈالتے شرم نہ آئی اُنہیں۔"

ایاز میاں نے ایک بڑا سا پتھر اُٹھا کر اپنی ہی دُکان پر دے مارا۔ شیشہ چور چور ہو کر سڑک پر پھیل گیا۔

5

خبر آئی کہ دِلّی کے ریذیڈنٹ ولیم فریزر کا خُون ہو گیا۔ نان بائی کی دُکان پر مرزا بیٹھے تھے۔ کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔

"سُنا ہے کسی پٹھان نے مارا ہے اُسے۔"

غالب نے سر ہلا کر نہ کہہ دیا۔

"میں جانتا ہوں ولیم فریزر کو کس نے مارا ہوگا۔ ضرور وہی ہوگا۔"

"کون ہے مرزا غالب؟"

غالب سر دُھنتے رہے۔

"ہے ایک ...... ایک نواب ہے ..... لُٹا ہوا، پٹا ہوا نواب۔"

اِس پر کوئی چرچا نہ ہوا کیونکہ اِس بیچ سورداس بھجن گاتا ہوا گلی سے گذر رہا تھا۔

بسر گئے سب تات پرائی

جب سے سادھو سنت ہوے پائی

نا کوئی بیری نا ہی بیگانہ
سکل سنگ ہم کو بن پائی

بسر گئے سب تات پرائی
اپنا نہیں دیس ، برانہ ہے ...

سُورداس کے کشکول (کمنڈل) میں لوگ سِکّے ڈال کے گذر جاتے تھے۔ سُورداس اپنے ہی رنگ میں رنگا، گلی قاسم جان کی جانب مُڑ گیا۔

6

مرزا غالب گلی قاسم جان میں داخل ہوئے۔ ایک لڑکا ہانپتا ہوا اُن کے پاس آ کر رُک گیا۔
"سلام علیکم مرزا صاحب۔"
مرزا نے سلام کا جواب دیا اور کھڑے ہو گئے۔ لڑکے نے رازدانہ انداز میں اُن کو یہ خبر سُنا دی۔
"خبر ملی ہے۔خبر ملی ہے...... آپ کو دینے کے لیے کہا ہے حاجی صاحب نے۔حاجی میر صاحب نے بتایا۔ نواب شمس الدین کو آج صبح منہ اندھیرے، کشمیری دروازے کے باہر...... پھانسی دے دی گئی۔"
"اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعوُن"
"آپ گھر جائیے۔سارے شہر میں دنگا مچ گیا ہے اور گولی چل رہی ہے۔ خُدا حافظ۔"
لڑکا اپنی بات کہہ کر، چاروں طرف نظر دوڑا کے ایک گلی کی طرف بھاگ گیا۔ مرزا گھر کی طرف مڑنے ہی والے تھے کہ ایک بھیانک دھماکہ ہوا۔کہیں نزدیک ہی توپ داغی گئی تھی۔

7

دِلّی

1857

کچھ لوگوں نے اِسے غدر کہا۔ کچھ لوگوں نے کہا۔ جنگِ آزادی۔ ایک بغاوت کا اعلان تھا۔ غالب نے درج کیا۔

'' ۱۱مئی۔ پیر کا دِن تھا۔

ہر طرف سواروں کے دوڑنے اور پیادوں کے پہنچنے کا شور مچ گیا۔ انگریزوں کے قتل کے بعد باغیوں نے شہر میں جابجا ڈیرے ڈال دیے۔

قلعے میں باغِ شاہی کو اپنے گھوڑوں کا اصطبل بنا لیا۔ بادشاہ نہ اِتنے بڑے لشکر کو قابو میں رکھ سکتا تھا، نہ اُس کا انتظام کر سکتا تھا۔ لٰہذا وہ خود لشکر کے قابو میں آ گیا۔ لڑائی شروع ہو گئی۔ رات دِن پتھروں کی طرح گولے برسنے لگے۔''

پھر ایک بڑی توپ کے داغے جانے کی آواز ہوئی۔

8

غدر کے دوران غالب گھر سے باہر نہ جا پائے اُنہیں منع کیا گیا تھا۔ دن بھر اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں پڑے رہتے۔ رات کا وقت تھا اور مرزا اپنا روزنامچہ لکھ رہے تھے۔

'' انگریزوں کا لشکر شہر میں داخل ہوا تو لوگ بلا امتیاز قتل ہونے لگے۔ شہر میں جو باقی رہ گئے تھے اُنہوں نے مقابلہ کیا۔ تین روز تک کشمیری دروازے سے لے کر چاندنی چوک تک کا علاقہ میدانِ جنگ بنا رہا۔ شہر کے تمام مکان اور دُکانیں بند ہوگئی تھیں۔ سامانِ خورد۔و۔نوش ختم ہوگیا۔ مینہ برسا تو چادر تان کر لوگوں نے پانی جمع کیا۔ چار ماہ چار دِن کے بعد انگریز دوبارہ دِلّی پر قابض ہونے لگے۔ اُن کے لشکر رات بھر شہر میں گشت کرتے۔''

فوجی بوٹوں کی آوازیں دِن رات سُنائی دیتیں۔ کہیں نہ کہیں سے توپ چھوٹنے کا دھماکہ کانوں میں پڑ جاتا۔ ایک رات مرزا کے دروازے پر دستک ہوئی۔ مرزا نے دستک سُنی اور آواز دی۔

'' کون ہے کلّو؟''

نیچے سے کلّو میاں نے جواب دیا۔

'' پتہ نہیں حُضور! میں ابھی دیکھتا ہوں۔''

کلّو میاں لالٹین لے کر آنگن میں آ گئے غالب نے اُوپر سے ہی کہا۔

'' ٹھہرو ٹھہرو! میں بھی آتا ہوں۔''

غالب دھیرے دھیرے آنگن میں آئے۔ چھڑی کھٹکھٹاتے ہوئے اور کلّو کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھے۔ آنگن میں ایک ستون کے پاس امراؤ بیگم آ کھڑی ہوئیں پھر سے دستک ہوئی۔ کلّو میاں نے دروازہ کھولنا چاہا مرزا نے روک دیا۔ اور پھر خود دروازہ کھولا۔ سامنے دیکھا۔ کلیان تھا۔ مرزا یوسف کا نوکر، اور ایک سِکھ سپاہی۔ غالب کا ماتھا ٹھنکا اُنہوں نے کلیان سے پوچھا۔

'' کلیان؟ کیا ہوا........ اِتنی رات گئے........ آپ کون ہیں؟''

'' مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہی ہیں۔''

'' راجہ نریندر سِنگھ کے؟''

'' جی۔ ہم ایک بُری خبر لائے ہیں غالب صاحب!''

مرزا اُس کا مُنہ تکنے لگے۔ سپاہی نے آگے آ کر اطلاع دی۔

'' یوسف میاں پُورے ہوگئے۔''

غالب کو اپنے کانوں پر یقین نہ ہوا۔

'' پورے ہوگئے؟......مر گئے؟''

سپاہی نے نظریں نیچے جھکا لیں۔ اندر، آنگن میں کھڑی امراؤ بیگم نے بھی سُنا۔ کلیان نے تفصیل دی۔

'' ہم سو رہے تھے۔ پتہ نہیں یوسف مرزا کب اُٹھے اور دروازہ کھول کر باہر چلے گئے۔ کچھ گورے سپاہی باہر

گشت پر تھے۔ ایک کی گولی سے ہلاک ہو گئے۔"

سپاہی نے اپنی تفصیل الگ سے دی۔

"ہمیں مہاراجہ صاحب نے حکیم شریف خان محمود خان کی حفاظت کے لیے رکھا ہوا تھا۔
حکیم صاحب نے ہم سے کہا، آپ کو خبر کریں۔"

غالب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ امراؤ بیگم وہیں اپنی جگہ کھڑی تھیں۔ غالب آنگن میں آئے۔ رسیوں پر کپڑے سوکھ رہے تھے۔ اُنہوں نے وہیں سے سفید چادر کھینچ لی اور کندھے پر ڈالی۔ بیگم جانے کب اُن کے پاس آ پہنچی تھیں۔ غالب دروازے تک آئے کلّو میاں سے کہا۔

"کلّو میاں روشنی دو۔ چل کے مٹی دیں گے۔"

سپاہی نے روکا۔

"مرزا صاحب آپ گلی سے باہر نہیں جا سکتے........ حُکم ہے۔"

غالب چڑ گئے۔

"جاؤں گا نہیں تو........ میرے بھائی کا کفن دفن کیسے ہوگا۔"

سپاہی نے سمجھایا۔

"حُضور باہر بہُت زیادہ تناؤ ہے۔ بڑی مُشکل سے اِن کو میرے ساتھ بھیجا ہے۔ آپ نہ جائیں تو اچھا ہے۔"

مرزا خاموش رہے۔ حُکم ماننا پڑا۔ کلیان اور سپاہی جانے کو ہوئے تو مرزا نے روکا۔

"ٹھہرو! ایک پل ٹھہر جاؤ۔"

اور کندھے پہ رکھی سفید چادر سپاہی اور کلیان کو سونپ دی۔ مرزا مجبور تھے۔ اپنے سگے بھائی کی میت پر نہیں جا سکے۔ امراؤ بیگم پاس کھڑی تھیں۔ دونوں خاموش تھے۔ مرزا وہیں دہلیز پر بیٹھ گئے۔ آنکھیں جھکائے اپنی پیشانی پر لِکھ رہے تھے :

ظُلمت کدہ میں میرے، شبِ غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

نے مژدۂ وِصال، نہ نظارۂ جمال
مُدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

داغِ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے ، سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ ، نوائے سروش ہے

مرزا غالب واپس آنگن میں آ گئے۔ اور لوٹ گئے اپنے ایک خط میں اُنہوں نے بھائی کی موت کا ذِکر کیا۔

" پانی۔ کفن۔ غسال۔ گورکن۔ اینٹ۔ چونا۔ گارا۔..... میت کو کہاں لے جاؤں۔ کس قبرستان میں سپرد خاک کروں؟ پڑوسیوں نے میری تنہائی پہ رحم کیا۔..... اور اُس کام کو انجام دیا۔ دو تین سفید چاد[illegible] گھر سے لیں۔ میرے دو ملازم، مہاراجہ پٹیالہ کا ایک سپاہی..... اور گلی کے سرے پر تیور خان کی مسجد کے صحن میں گڑ[illegible]دوا۔ اور میت کو اُس میں اُتار کر مٹی پاٹ دی۔

" اِناّ للہ ...."

آنگن سے کلّو میاں کی لالٹین اُٹھا کر مرزا سیڑھیاں چڑھ گئے۔

سترّہ

1

گلی قاسم جان میں پھر فجر کی آذان سُنائی دی۔ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے ویسے ہی دو پیر نمودار ہوئے۔ مرزا غالب عمر رسیدہ تھے۔ اپنی پھٹی ہوئی جُوتی چٹخاتے مرزا نکڑ والی مسجد کی طرف بڑھے۔ اُس طرف پردے کے پیچھے سے امراؤ نے آواز دی۔

"اے سُنو ......"

پھر اُسی طرح غالب پیچھے مڑے اور بیوی سے مخاطب ہوئے۔

"تم ضرور پیچھے سے آواز دے لیتی ہو۔ دِن رات بس مُجھ پر نظر لگائے رکھتی ہو۔"

پردہ ہٹا کر بیگم باہر آ گئیں۔

"ائے ہائے۔ کہیں نظر نہ لگ جائے تمھیں، بڑے میاں!"

"تو کیا میں بھاگ جاؤں گا کہیں؟"

"اے تب نہ بھاگے جب بھگانے والیاں، سُرمہ مِسّی لگا کر منڈلایا کرتی تھیں۔"

"تو پھر صبح صبح کیوں اُٹھ جاتی ہو؟"

"میں اُٹھتی ہُوں اپنے اللہ کے لیے...... جو آواز دے رہا ہے۔ تُمھیں ہو جو سُنی ان سُنی کیے جاتے ہو۔ روز جاتے ہو مسجد تک، اور اُلٹے پاؤں لوٹ آتے ہو۔"

"وہ واپس بھیج دیتا ہے تو لوٹ آتا ہُوں۔ بُلا لیتا تو وہیں کے وہیں چلا جاتا اُس کے پاس۔"

امراؤ کو بس مرزا کی یہی بات اچھی نہیں لگتی جب دیکھو تب جانے کی بات کرنے لگتے ہیں۔

"اب جلدی لوٹ آنا۔ شہر میں وبا پھیلی ہے۔ سر سے غدر اُترا نہیں، کہ وبا نے آ پکڑا شہر کو۔ جانے کیا لِکھا ہے دِلّی کی قسمت میں۔"

"کاہے کی وبا؟ کیسی وبا؟ میں اکھتر برس کا بوڑھا، تُم چونسٹھ کی بُڑھیا۔ ہم میں سے ایک بھی مرتا تو جانتے کے وبا آئی ہے۔"

بڑبڑاتے ہوئے مرزا چھڑی کھٹکھٹاتے گلی میں چل پڑے اور کہتے گئے۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو، اور ہم زباں کوئی نہ ہو

مرزا نے مُڑ کر گھر کی طرف نظر ڈالی۔ دیکھا کہ وہ اب وہاں نہیں ہے۔

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

2

غالب چلتے ہوئے قبرستان میں نکل آئے۔ ایک قبر پر فاتحہ پڑھا اور واپس لوٹ ہی رہے تھے کہ وہیں قبرستان میں کسی نے آواز دی۔

"مرزا نوشہ؟"

غالب رُک گئے۔ یہ آواز کالے میاں کی تھی۔ مُڑ کے دیکھا، پورا بھیس ہی فقیرانہ تھا۔ پاس آ کر انہوں نے مرزا کو دُعا دی۔ پہلے کی طرح اُن کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ مرزا نے پوچھا۔

"یہاں کہاں کالے میاں؟"

"بس یہیں خارجی دروازے پہ آ بیٹھتا ہوں۔ ہر باہر جانے والے کا چہرہ دیکھ لیتا ہوں۔"

دونوں دروازے کی طرف چل دیے۔

"تُم یہاں کیسے؟"

"شمس کا فاتحہ قرض تھا مجھ پر۔ سو ادا کر آیا۔ بڑا افسوس ہوا تمہاری حویلی بھی لوٹی گئی غدر میں۔"

کالے میاں مُسکراتے ہُوئے بولے۔

"اور اُس میں تمہاری بیگم کے زیورات بھی لُٹ گئے۔ جب دنگہ شروع ہُوا شہر میں تو میرے پاس چھپا گئی تھیں۔ یہ سوچ کر کہ صُوفیوں کے ٹھکانے کو کوئی نہ چھوئے گا۔"

غالب ہنس پڑے۔

"بتایا نہیں بڑھیا نے، چھپا گئی ہم سے۔"

"باقی یار باشاں کی کیا خبر ہے؟"

"بھائی تفتہ تو میرٹھ جا بسے۔ پہلے بھی وہاں ایک گھر تھا اُن کا.......مفتی صدالدین لاہور چلے گئے......
نواب شیفتہ کی آدھی جائداد انگریزوں نے ضبط کر لی......حکیم رضی الدین ابھی اُس روز ہم سے چہل کرتے تھے۔ لو
گدھے بھی آم نہیں کھاتے۔ ایک خاکی کی گولی کا شکار ہو گئے......طالع یار خان کے دونوں جوان بیٹوں کو پھانسی ہوئی
........منشی ہیرا سنگھ درد، پنڈت شوجی رام اور بال مکند نے جان پر کھیل کر مدد کی غدر کے دنوں میں، ورنہ دِلّی کے
مسلمانوں پر جو گزری ہے، اللہ ہی جانتا ہے۔"

"اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت کو جمع ہوں، تو ہوں!"

"وہاں کیا خاک جمع ہوں گے........سُنی الگ، شیعہ الگ۔ نیک جُدا ..... بد جُدا۔"

غالب نے احوال سُنایا۔

"چند گورے ایک روز کوچہ بندی کی دیوار پھلانگ کر آ گھسے محلّہ میں.... پٹیالہ کے سپاہیوں نے بہُت کوشش کی
روکنے کی۔ لیکن وہ لوگ سیدھے میرے گھر میں آ دھمکے۔ کسی نے خبر دی تھی کہ میں نے باغیوں کو گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔"

"پھر ؟....."

"بس مجھے اور میرے ہمسایوں میں سے چند آدمیوں کو پیدل چلا کر لے گئے۔"

کالے میاں نے سر ہلا کر حامی بھری۔

"تفتیش ہو رہی تھی کہ شہر میں کون کون سے محلّہ میں مسلمان مقیم ہیں۔ ہم سب کو قلعہ کے اُسی احاطے میں لے
گئے، جہاں کبھی اپنے باشا سے ملا کرتے تھے۔........کوئی کرنل براؤن تھے۔ جب میری باری آئی تو مجھ سے ایک ہی
سوال پوچھا۔"

لال قلعہ کے احاطہ میں کافی لوگوں کو گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ اُنہیں ایک انگریز۔ کرنل براؤن کے سامنے
لایا جا رہا تھا۔ غالب سے براؤن نے ایک ہی سوال پوچھا۔

"ویل تُم مُسلمان؟"

"جناب آدھا ہُوں!"

کرنل براؤن حیران ہُوا۔

" آدھا؟ .....'آدھا مسلمان' کیا مطلب؟"
" قبلہ شراب پیتا ہوں۔ سُور نہیں کھاتا۔ اِس لیے آدھا کہا۔"
کرنل براؤن ہنس پڑا۔
" گڈ۔ گڈ ..... ہی کانٹ بی باگی۔ (یہ باغی نہیں ہوسکتا)"

قبرستان میں لطیفہ سُن کر۔ کالے میاں بھی ہنس پڑے۔
" بس اُسی لطیفے نے سہولیت کردی۔"
کچھ قدم چل کر مرزا نے کہا۔
" مگر ظفر بہت یاد آیا اُس روز..... بڑا یار بادشاہ تھا۔"
کالے میاں اچانک سنجیدہ ہوگئے اُنہوں نے مرزا کو روکا اور کہا۔
" پتہ نہیں مرزا، تمہیں خبر ملی کہ نہیں....."
" کیا؟"
" سات نومبر، جمعہ کے روز۔ ظفر بادشاہ اِس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اُنہیں وہیں رنگون میں دفنا دیا گیا۔"
" اِنَّالِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔"
اور اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کالے میاں نے یاد کیا۔

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

3

چوک پر کالے میاں کی آواز جرس کی طرح گونج رہی تھی۔ کالے میاں کی آواز نے طلسم پیدا کردیا۔ رات کے سناٹے میں لوگ چوک میں جگہ جگہ کھڑے سُن رہے تھے۔ برآمدوں، کھڑکیوں اور چھتوں سے۔ یہ بہادر شاہ کی

گونجتی ہوئی آواز تھی جس نے دِلّی کی روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔
گلی قاسم جان میں اپنے گھر کی چھت سے مرزا غالب نے بھی دِلّی کی روح کی چھٹپٹاہٹ محسُوس کی۔
جیسے کسی اِنقلاب کے گلے میں اُنگلی دبا کر، آواز گھونٹ دی ہو۔
یہ ہندوستان کے آخری مُغل کی آواز تھی۔

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مِرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

اپنا دیوانہ بنایا مُجھے ہوتا تُو نے
کیوں خرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا

خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مُجھے
کاش خاکِ درِ جاناناں بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مُجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

روزِ معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

4

غدر اور اُس کے بعد کے واقعات نے دِلّی کے گلی کوچوں پر اپنے نشان چھوڑ دیے تھے۔ مرزا نے آس پاس کی بربادی دیکھی۔ چوک کے بازار میں پہلی بار جب مرزا پہنچے تو حاجی میر کی جلی ہوئی دُکان دیکھی۔ دو ترکھان لکڑی کے شہتیروں پر کام کر رہے تھے۔ حاجی میر نے مرزا کو آتے دیکھا تو اُن کی طرف آ گئے۔

''سلام علیکم۔''

''وعلیکم سلام۔''

دونوں دوست گلے لگے۔ حاجی میر نے ایک موڑھا دوست کے لیے کھینچ لیا۔

''بالآخر۔ پھر سے دُکان بسانے کا ارادہ کر ہی لیا۔''

حاجی میر نے اِنکار میں سر ہلایا۔

''ترکھان لگائے ہیں۔ جلی بھُنی صورت اِس دُکان کی اب اچھی نہیں لگتی۔''

''کِتنے کا مال جل گیا؟''

''کچھ نہ پوچھو......کوئی اندازہ نہیں ہے۔ کِتابوں کا حساب تو کر لوں لیکن اُس کلام کا حساب کہاں سے لاؤں، جو کتاب تک بھی نہ پہنچا اور جل گیا......تمہارا کِتنا کلام جلا، اِس کا کچھ اندازہ ہے؟''

غالب مُسکرا دیے۔

''غلط کاریاں جل گئیں جوانی کی....''

پاس ہی ایاز کی جلی ہوئی دُکان تھی۔ مرزا کے مُنہ سے آہ نکلی۔

''یہ ایاز کی دُکان ہے نہ !''

''تھی......''

''نظر نہیں آتے.....''

''سُنا ہے حج پر نکل گئے۔ بڑا درد تھا وطن کا اُس میں۔''

'' ہوں۔''

اور حاجی یاد میں کھو گئے۔

'' کیا بتاؤں، مرزا! ہندوستان کہتے کہتے اُس کی آنکھیں بھر آیا کرتی تھیں۔''

ایک وقفہ خاموشی کا۔ پھر مرزا نے بات بدلنے کے لیے پوچھا۔

'' میر صاحب! وہ قہوہ اب بھی مِلتا ہے پٹنی دروازے کا؟''

میر صاحب حرکت میں آ گئے۔

'' ملے گا...... اے میاں لمڈے۔ ذرا جائیو! حنیف سے کہہ دو یہاں قہوہ بھجوا دے۔''

غالب پھر کہیں کھو گئے۔ حاجی میر نے پوچھا۔

'' طبیعت کیسی ہے اب؟''

غالب لوٹ آئے۔ ایک عمر کے بعد اپنی اصلی اور مصنوعی بیماریوں کا تذکرہ بھی ایک دلچسپ شُغل ہے اور مرزا اِس سے اچھوتے نہ تھے۔

'' ناتوانی زوروں پر ہے۔ بوڑھاپے نے نِکما کر دیا ہے۔ ضعف، سُستی، کاہلی، گراں جانی، نہ رکاب میں پاؤں ہے۔ نہ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر در پیش ہے۔''

'' بہت عزیز و اقارب کھوئے اِس غدر میں۔''

غالب کا بیان جاری رہا۔

''اِن تین برسوں میں ہر روز مرگِ نو کا مزا چکھتا رہا۔ حیران ہُوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں۔ پھر میں کیوں جیتا ہوں۔ حواس کھو بیٹھا .... حافظہ کو رو بیٹھا .... اگر اُٹھتا ہوں تو اِتنی دیر میں، جتنی دیر میں ایک قدِ آدم دیوار اُٹھے۔''

اِس بیچ قہوہ آ گیا۔ مرزا نے ایک پیالہ اُٹھا لیا۔

'' آگے ناتواں تھا۔ اب نیم جان ہوں۔ اکہتّر برس جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں۔ مہینوں اور دِنوں کی ہے۔''

دونوں دوست قہوہ پیتے رہے۔ اِس دوران ایک آلاپ سُنائی دی۔ آواز اُوپر سے آ رہی تھی۔ بعد میں سارنگی بھی اُس آلاپ میں شامل ہو گئی۔ دونوں اُوپر والے کوٹھے کی طرف دیکھنے لگے۔ غالب نے شعر پڑھا:

صد جلوہ رُو برُو ہے جو مژگاں اُٹھائیے
طاقت کہاں کہ دِید کا احساں اُٹھائیے

سامنے سے ایک تانگہ گزرا۔ اُس پر نگاڑے تھے اور منادی والا نگاڑہ بجا رہا تھا۔ چوک میں منادی والے

نے سرکار کی طرف سے منادی سُنا دی۔

'' ہر خاص و عام کو اِطلاع دی جاتی ہے کہ بحکم گورنر جنرل لارڈ جنرل ایلن برا/لارڈ کنگ۔...... پہلی تاریخ کی رات کو، تمام خیر خواہانِ انگریز، اپنے اپنے گھروں کے باہر روشنیاں کریں۔ دُکانوں، بازاروں اور صاحب کمشنر بہادُر کی کوٹھی پر بھی چراغاں ہوگا۔''

منادی کے بعد تانگہ آگے نکل پڑا۔ اِس بیچ چوک میں لوگ جمع ہونے لگے اور دِل کی بھڑاس لبوں تک آ گئی۔

'' آخر کار دِلّی میں کچھ امن و امان کے آثار تو پیدا ہُوے۔''

'' مُردوں کی بستی میں چراغ جلانے سے امن ہو جاتا ہے کیا ؟''

'' ایسی حماقت نہ کریں، میاں! رات کو گورے گشت کریں گے۔ اور اگر تمہارے گھر کے باہر چراغ نہ ہُوا تو پکڑے جاؤ گے۔''

'' ہم تو چراغ جلائیں گے قبرستان میں، جہاں ہمارے یار دفن ہوئے ہیں۔''

اِتنا کہہ کر دوسرا شہری غصّے کی حالت میں چلا گیا۔

5

سبھی مکانوں میں۔ دروازوں پر چراغان ہُوا، دو۔ دو اور چار۔ چار کی ٹکڑیوں میں گورے گھوڑ سوار رات کو گشت لگاتے رہے۔ آس پاس چراغ جل رہے تھے۔ وہ گلی قاسم جان میں بھی داخل ہوئے۔ گلی قاسم جان میں مرزا غالب کے گھر بھی دیئے جلائے گئے تھے۔

6

سویرے نانبائی کی دُکان پر کئی مُقامی لوگ جمع تھے۔ نانبائی کا لڑکا انگیٹھی اور تندور جلا رہا تھا۔ نانبائی داتن کر رہا تھا اور رات کے چراغاں کی بات چل پڑی۔ ایک شخص نے کہا۔

'' ارے میاں! سر میں ابھی تک گھوڑوں کی ٹاپیں بج رہی ہیں۔ ساری رات گشت لگا رہے تھے گورے۔''
'' کوئی پکڑا بھی گیا کیا؟ یوں تو سارا شہر چراغاں تھا۔'' نانبائی نے پوچھا۔
'' ہاں بہت سوں کو تو گھر سے ہی پکڑ کر لے گئے، رات کو!'' دوسرے شخص نے بتایا۔
'' اچھا ؟''
'' اور کیا! ایک نے تو کمال کر دیا۔ اپنے گھر ہی کو آگ لگا دی۔ اور سڑک پر کھڑا ہو کے چلّانے لگا..... دیکھو لوگو! میرا گھر بھی چراغاں ہو رہا ہے۔''
نانبائی ہنسنے لگا۔
''اچھا کون تھا وہ؟''
'' کوئی راجپوت تھا، کہتے ہیں۔''
'' اُسے تو کچھ نہ کہا ہوگا۔''
'' دھر کے لے گئے اُسی وقت۔ یہی تو چال ہے فرنگیوں کی۔ ایک ہی جھٹکے میں پتہ لگا لیا۔ کون ساتھ میں ہے، کون نہیں ہے۔''
اب انگیٹھی سلگنے لگی تھیں۔ نانبائی نے پھر پوچھا۔
'' جن کو پکڑا ہے، کیا کریں گے اُن کا؟''
'' کچھ کو سنا ہے رات کی رات پھانسی پہ لٹکا دیا مہرولی میں۔ درختوں پر لاشیں لٹکی ہوئی ہیں۔ بیا کے گھونسلوں کی طرح۔''

7

مرزا سے رہا نہیں گیا۔ وہیں پہنچ گئے۔ مہرولی میں پیڑوں سے لٹکی ہوئی لاشیں جھول رہی تھیں۔ کچھ جگہ چتائیں جل رہی تھیں اور چاروں طرف دُھواں ہی دُھواں تھا۔ کچھ لوگ مرے ہوئے لوگوں میں اپنے اپنے رشتہ داروں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اُن میں ایک حاجی میر بھی تھے۔ ذوق کے چوک کے پاس والے ایک لڑکے کی لاش بھی اُن میں تھی۔ اب اُس دھویں میں غالب بھی موجود تھے۔ تھوڑی دُور پر حافظ دِکھائی دیا۔ اُس کے کپڑے تار تار تھے۔ غالب نے اپنا دوشالہ اُسے اوڑھا دیا۔ حافظ نے مرزا کا لمس پہچان لیا۔
'' مرزا نوشہ! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

غالب نے جواب میں شعر کہا۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

"سب خیریت تو ہے؟ آپ کا حال کیا ہے؟"
" ہمارا حال اب ہم سے کیا پوچھتے ہو حافظ میاں۔ کچھ روز بعد ہمار ہمسایوں سے پوچھنا۔"
غالب اب وہاں سے چل پڑے، بڑبڑاتے ہوئے۔
" اب تھک گیا زندگی سے۔ اِن دنوں اتنے جنازے اُٹھائے ہیں کہ لگتا ہے جب میں مروں گا، مجھے اُٹھانے والا کوئی نہ ہوگا۔"
غالب دُور جانے لگے۔ دُھویں اور روشنی کی پیڑوں سے چھن کر آتی شعائیں اُنہیں چھو کر زمین پر گر رہی تھیں۔
اِس کے ٹھیک دو سال بعد 15 فروری 1869 کے روز مرزا غالب انتقال فرما گئے۔ اُنہیں چونسٹھ کھمبا کے نزدیک خاندان لوہارُو کے قبرستان میں دفنایا گیا۔
غالب ابھی بھی چلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور پسِ منظر میں اُن کی آواز گونج رہی تھی۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہُوا جب غم سے یوں بے حِس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جُدا تن سے تو زانوں پر دھرا ہوتا۔

غالب کا چلنا جاری رہا۔ اُن کے قدموں کی آہٹ ابھی تک سُنائی دیتی ہے!

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔

تمام شد